إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

اکتوبر ۲۰۲۱ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ کے زیرِ انتظام

تدریس القرآن پراجیکٹ

فری کتابیں اور فری ٹیچرز ٹریننگ

* سکولوں میں آسان انداز میں ترجمۂ قرآن سکھانے کا پروگرام
* پانچویں جماعت سے اوپر کی جماعتوں کے لیے
* اساتذہ کی گائیڈ اور طلبہ کی کتاب بلا ترجمہ الگ
* دو رنگوں میں نفیس طباعت
* لاہور کے سکولوں میں تنفیذ کی خصوصی مہم جاری ہے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

0300-4107282   300-4354673

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

عصری تعلیم کی اصلاح

	قیمت
ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۶۰۰
اسلامی سکول کے خدوخال	۱۵۰
تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۳۰۰
یکساں قومی نصاب۔ خدشات و مضمرات	۲۵۰
تدریس القرآن ① برائے معلمین (ڈاک خرچ)	۵۰
تدریس القرآن ① برائے طلبہ وطالبات (ڈاک خرچ)	۵۰
پنج سورہ (اُردو تفہیم) (ڈاک خرچ)	۵۰
اسلامی علوم میں تحقیق: اصول، ترجیحات اور معیار	۳۵۰
ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت (زیرِ طبع)	

طلبہ کی اسلامی تربیت

تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۲۵۰
تعلیمی اداروں میں تعمیرِ سیرت۔ ہینڈ بک وگائیڈ	۳۰۰

اصلاحِ دینی مدارس

ہمارا دینی نظامِ تعلیم	۴۵۰
نصابِ مدنیؒ	۸۰
مدرسہ ڈسکورسز۔ مطالعہ وتجزیہ	۲۵۰
اصلاحِ دینی مدارس	۴۰۰

اسلامی تحریکیں

پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟	۳۰۰

	قیمت
ایک نئی ہمہ جہت اصلاحی تحریک کی ضرورت (ڈاک خرچ)	۴۰
خاموش انقلاب۔ ناگزیر ہے	۳۵۰
عصرِ حاضر میں دین کا متوازن تصور	۱۵۰

تزکیۂ نفس

اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۱۵۰۰
حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۸۰
اپنی اصلاح آپ کیسے؟	۸۰
ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۳۵۰
اسلام اور تعمیر سیرت (زیرِ طبع)	

مغربی فکر وتہذیب

اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۳۵۰
اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۲۵۰
اسلام اور ردِّ مغرب	۳۰۰

فہم دین

مسلم نشاۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل	۴۷۵
مقالاتِ امین (جلد اوّل)	۱۰۰۰
مقالاتِ امین (جلد دوم)	۱۰۰۰
شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت	۵۰

مکتبہ البرہان

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔ فون 0309-4607124 ای میل ermpak@hotmail.com

ماہنامہ

البرہان لاہور

جلد ۲۵، شمارہ ۱۰، اکتوبر ۲۰۲۱ء/صفر ۱۴۴۳ھ

مدیر: ڈاکٹر محمد امین　　نائب مدیر: پروفیسر ملک محمد حسین

مشمولات

○فکر و نظر

ڈٹے رہیے	مدیر	۵

○اسلام اور پاکستان

۔ اشاعتِ اسلام جرم ہے؟	مفتی محمد تقی عثمانی	۶
۔ دینی قوتیں: پسپائی کی کوئی حد بھی ہے؟		۷
۔ پاکستان میں نفاذ اسلام: کیا، کیوں اور کیسے؟	ڈاکٹر محمد امین	۸
۔ ملی مجلس شرعی کو سارے مکاتب فکر کی غیر سیاسی دینی جماعت بنانے کا فیصلہ کیوں کیا گیا؟		۱۰

○تعلیم و تربیت

۔ ہماری درسگاہوں میں 'العلم' کا فقدان	ڈاکٹر ابصار احمد	۱۴
۔ تعلیم اور عالمی استعمار	سید خالد جامعی	۲۲
۔ تعلیم کو استعمار کے پنجے سے نکالنے کی ضرورت	مریم سکینہ	۲۴
۔ مدرسہ ڈسکورسز متجددین کی سرگرمی اور دینی مدارس کی سستی و بے حسی	مدیر	۲۶

○تزکیۂ نفس

آؤ! اللہ سے دوستی کرلیں اور پھر اس کے کرشمے دیکھیں	رعایت اللہ فاروقی	۲۷

○تفہیم مغرب

۔ مغربی تہذیب دینِ کفر اور دینِ غیر اللہ ہے (دوسری قسط) مسلمانوں پر اس کا رد واجب اور اس کی پیروی حرام ہے		۳۰
۔ مسلمانوں کو کچلنے کے امریکی منصوبے سابق امریکی جنرل ولزلے کلارک کے انکشافات واعترافات	ڈاکٹر محمد امین	۴۱

○تفہیم دین

۔ قانون واخلاق کا باہمی ربط	صابر علی	۴۲
۔ تجدد گمراہی ہے اور قابلِ ردّ ہے	مدیر	۴۸
۔ مسلمان اور فکری پسماندگی	حافظ عمران رضا طحاوی	۴۹

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
پروفیسر ملک محمد حسین
سید خالد جامعی
حافظ عمران رضا طحاوی

انچارج سرکولیشن
(0309-4607124)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 45 روپے
سالانہ 500 روپے۔ پانچ سال: 2000 روپے
تاحیات 10,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
A/c # 02011478219

برائے رابطہ
15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور
ermpak@hotmail.com

برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhanmonthly.org

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف
0306-4640366

○افغانستان

- امارتِ اسلامیہ افغانستان — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۵۱
ہیومن رائٹس، میڈیا کی آزادی اور حقوق نسواں کی پالیسی

- طالبان کا افغانستان — سید خالد جامعی — ۵۵
طالبان کا اصل کارنامہ۔مغربی تصورات کے مطابق معاشی ترقی

- افغان طالبان کو درپیش دو بڑے چیلنج — مدیر — ۵۸
مغربی تہذیب کا رڈ اور عوام کی ذہن سازی

- کیا افغان نظامِ حکومت مطابقِ شریعت ہے؟ — ۶۲

○اسلامی تحریکیں

- جماعتِ اسلامی: کل — مولانا عبدالغفار حسنؒ — ۶۴
سابق امیر جماعت کا ۱۹۹۳ء میں جماعت پر تبصرہ

- جماعت اسلامی: آج — پروفیسر ملک محمد حسین — ۶۹
جماعت کی ۸۰ سالہ جدوجہد کا تجزیہ اور کامیابی کے لیے تجاویز

○مطالعۂ کتاب

- 'خاموش انقلاب ناگزیر ہے' — ڈاکٹر اختر حسین عزمی — ۷۵
- 'گوانتانامو بے کی کہانی، ملّا ضعیف کی زبانی' — نعمان ہاشمی — ۸۱

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنایئے۔

زراعانت: سالانہ 500روپے پانچ سال:2000روپے تاحیات:10,000روپے

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

فکرونظر

ڈٹے رہیے

طالبانِ ذیشان!

آپ بخوبی جانتے ہیں کہ امریکی و یورپی طاغوت نے آپ کی حکومت اس لیے ختم کی تھی کہ آپ افغانستان میں ٹھیٹھ اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست چلا رہے تھے۔ ۱۱/۹ اور اسامہ کو حوالہ کرنے کا مطالبہ تو ایک بہانہ تھا۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم اور کیپٹل ازم پر مبنی مغربی تہذیب اس خوف کا شکار تھی کہ اگر ملاّ عمر نے افغانستان میں ٹھیٹھ اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست کامیابی سے چلالی اور اچھے نتائج پیدا کر کے دکھا دیے تو پھر مغربی تہذیب کا مستقبل کیا ہوگا؟

پھر آپ نے اللہ کے حضور اپنی جانیں قربان کر کے حق کی شہادت پیش کی، طاغوت کی مزاحمت کی اور بالآخر اللہ تعالیٰ کے فضل سے آپ بیس سال کی جدوجہد سے عالم کفر اور اس کے سرداروں کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔ فللّٰہ الحمد والشکر.

اب عالمِ کفر اور اس کے موالی چاہتے ہیں کہ ان کا واسطہ ''نئے'' طالبان سے پڑے جو کفر اور عالم کفر کے بارے میں ''نرم'' رویہ رکھتے ہوں، جو مغربی جمہوریت، بنکوں کے سودی نظام، خواتین کی بے حجابی اور موسیقی کی ٹھناٹھن کو برداشت کریں بلکہ اپنا لیں۔

نہیں! ہرگز نہیں! ہمیں پرانے طالبان چاہئیں۔ ہمیں ملاّ عمر (رحمہ اللہ) والا افغانستان چاہیے۔ ہمیں مغربی تہذیب کو پاؤں کی ٹھوکر پر رکھنے والا ملاّ عمر والا اسلامی نظام چاہیے۔

ڈٹے رہیے! اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ اس وقت کفر کے مقابلے میں نرمی، رخصت اور کمپرومائز کی نہیں عزیمت کی ضرورت ہے جس اللہ نے آپ کو بیس سالہ جنگ میں کامیابی بخشی وہ اس پُرامن جنگ میں بھی آپ کو، ان شاء اللہ، ضرور سرخرو کرے گا۔ کفر کے مقابلے میں ڈٹے رہیے، ذرا نرمی نہ دکھایئے، کمپرومائز نہ کیجیے البتہ فراست و حکمت بھی مومن ہی کے ہتھیار ہیں انہیں ضرور استعمال کیجیے۔

اسلام اور پاکستان

مفتی محمد تقی عثمانی

کیا اشاعتِ اسلام جرم ہے؟

اخبارات کے مطابق سندھ اسمبلی نے اقلیتوں کے حقوق کے عنوان سے ایک بل منظور کیا ہے جس کی رُو سے کسی غیر مسلم کے اٹھارہ سال کی عمر سے پہلے اسلام لانے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے اور اسے قابل تعزیر جرم قرار دے دیا گیا ہے۔ اسلام لانے پر پابندی کا یہ قانون شریعت اسلامیہ اور عدل وانصاف کے تمام تقاضوں کو پامال کرنے کے مترادف ہے۔ یہ درست ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے کسی کو زبردستی مسلمان بنانا ہرگز جائز نہیں، اور اس پر پابندی حق بجانب ہے، لیکن دوسری طرف برضا و رغبت اسلام لانے پر پابندی لگا کر کسی دوسرے مذہب پر باقی رہنے کے لیے مجبور کرنا بدترین زبردستی ہے جس کا نہ شریعت میں کوئی جواز ہے، نہ عدل وانصاف کی رُو سے اس کی کوئی گنجائش ہے۔ اسلام کی رُو سے اگر کوئی سمجھدار بچہ جو دین و مذہب کو سمجھتا ہو، اسلام لے آئے تو اس کے ساتھ مسلمانوں جیسا سلوک کرنے کا حکم ہے۔ نیز اسلامی شریعت کی رُو سے بچہ پندرہ سال کی عمر میں، بلکہ بعض اوقات اُس سے پہلے بھی بالغ ہوسکتا ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ وہ بالغ ہو کر شرعی احکام کا مکلف ہو چکا ہے، اسے اسلام قبول کرنے سے تین سال تک روکنا سراسر ظلم اور بدترین زبردستی ہے۔

اس قسم کی زبردستی کا قانون غالباً کسی سیکولر ملک میں بھی موجود نہیں ہوگا، چہ جائیکہ ایک اسلامی جمہوریہ میں اس کو روا رکھا جائے۔ نیز اٹھارہ سال کے بعد اسلام قبول کرنے کے لیے اکیس دن کی مہلت دینا بھی ناقابل فہم ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس مدت میں اس کے اہل خاندان اسے دھمکا کر اسلام لانے سے روکنے میں کامیاب ہوسکیں؟ پھر سوال یہ ہے کہ اگر دو میاں بیوی قانون کے مطابق اسلام لے آئیں، تو کیا اس قانون کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ ان کے بچے اٹھارہ سال کی عمر تک غیر مسلم ہی تصور کیے جائیں گے کیونکہ انہیں اس عمر سے پہلے اسلام لانے کی اجازت نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قانون اس کے تمام مضمرات پر غور کیے بغیر محض غیر مسلموں کو خوش کرنے کے لیے نافذ کیا گیا ہے۔ مَیں عام مسلمانوں، دینی اور سیاسی جماعتوں سے اپیل کرتا ہوں کہ اس شرمناک قانون کو منسوخ کروانے کے لیے اپنا دینی فریضہ ادا کریں۔ وفاقی شرعی عدالت سے بھی جسے از خود نوٹس لے کر کسی قانون کا قرآن وسنت کی روشنی میں جائزہ لینے کا اختیار حاصل ہے، ہمارا مطالبہ ہے کہ اس قانون کے بارے میں وہ اپنے اس اختیار کو استعمال کر کے اسے غیر مؤثر قرار دے۔

اسلام اور پاکستان   مدیر

دینی قوتیں۔ پسپائی کی کوئی حد بھی ہے؟

ایک آدھ استثناء کو چھوڑ کر ہمارے اکثر حکمران ایسے رہے ہیں جو مغربی فکر وتہذیب کو دنیا میں ترقی، خوشحالی اور کامیابی کی کلید سمجھتے ہیں اور اسلام کو نماز روزے تک محدود سمجھتے اور رکھنا چاہتے ہیں۔ ہماری موجودہ حکومت بھی مغرب پرستی اور مغربی دباؤ کو قبول کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں۔ اور پاکستان میں فرد، معاشرے اور ریاست کی سطح پر جتنا اسلام نظر آتا ہے وہ دینی قوتوں کی جدوجہد کا نتیجہ ہے لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ دینی قوتیں بھی تھک گئی ہیں یا بے حس ہوگئی ہیں۔

پچھلے چند ماہ میں ہونے والی اسلام کش قانون سازی کو دیکھیے۔ پہلے اوقاف کا قانون پاس کیا گیا اور ساری صوبائی اسمبلیوں سے بھی پاس کرایا گیا جس پر اگر عمل کیا جائے تو پاکستان کی کوئی مسجد اور مدرسہ اپنا آزادانہ وجود برقرار نہ رکھ سکے گا۔ پھر گھریلو تشدد کے نام پر قانون پاس ہوا جس نے اسلام کے معاشرتی اصول وروایات کی دھجیاں اڑا دیں۔ چند روز بعض علماء کرام کے بیانات اخبارات میں سامنے آئے اور پھر بات ختم۔ اوقاف قوانین اور گھریلو تشدد والے قوانین کے خلاف کوئی ٹھوس کام نہیں ہوا۔ نہ انہیں عدالتوں میں چیلنج کیا گیا اور نہ ان کے خلاف دینی قوتوں کو اکٹھا کر کے کوئی تحریک چلائی گئی کہ حکومت انہیں واپس لینے پر مجبور ہوتی یا کم از کم ان میں ضروری ترامیم ہی کر دیتی۔

اور اب سندھ اسمبلی نے قانون پاس کر دیا ہے کہ اشاعت اسلام جرم ہے۔ بعض صورتوں میں کسی کو مسلمان کرنے والے کو جرمانے اور جیل کی سزا دی جائے گی۔ یہ قانون ممکن ہے مرکز بھی پاس کر دے لیکن جن دینی قوتوں نے اوقاف قوانین کے خلاف کچھ نہیں کیا جو ان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے، ان سے کیا توقع کی جائے کہ وہ اس نئے غیر اسلامی قانون کے خلاف اٹھیں گے۔

پھر ملک کی اخلاقی حالت تباہ ہو چکی۔ فحاشی، عریانی، زنا بالرضا وبالجبر، ملاوٹ، کم تولنا، جھوٹ، چوری، ڈاکے، فراڈ، بددیانتی اتنے عام ہو گئے کہ اب یہ جرم ہی نہیں لگتے۔ کون سا عالم دین ہے جو نہیں جانتا کہ یہ وہ اعمال بد ہیں جو قوموں کے زوال کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن پاکستان کی دینی قوتیں سوئی پڑی ہیں، کوئی متحرک ہونے کو تیار نہیں، کوئی متحد ہونے کو تیار نہیں!

سوال ہے پانچ لاکھ ائمہ مساجد سے، ۳۵ ہزار دینی مدارس کے ڈیڑھ لاکھ علماء کرام سے اصلاحی وتبلیغی جماعتوں اور دینی سیاسی جماعتوں کے لاکھوں کارکنوں سے کہ وہ کب حرکت میں آئیں گے؟ کب متحد ہوں گے؟ کب بے دینی اور بد اخلاقی کی اصلاح کے لیے اٹھیں گے؟

اسلام اور پاکستان مدیر

پاکستان میں نفاذِ اسلام
کیا، کیوں اور کیسے؟

اس عنوان سے تنظیم اسلامی پاکستان نے ایک سیمینار ۱۹ ستمبر ۲۰۲۱ءکو لاہور میں منعقد کیا جس کی مختصر روداد ہم نے پڑھی ہے۔

پاکستان میں اسلام نافذ نہیں ہوسکا اور موجودہ حالات میں ہوبھی نہیں سکتا، اس کے متعدد بنیادی اسباب ہیں جن کی طرف ہم یہاں اختصار سے اشارہ کریں گے:

۱۔ کچھ دینی جماعتیں دین کی ایک خاص تعبیر'اقامت دین' کے عنوان سے کرتی ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ دین کوئی اوپر سے 'نافذ' کرنے کی چیز ہے، جس کے لیے'ریاستی قوت' ناگزیر ہے اور ریاستی اقتدار حاصل کرنے کے لیے سیاسی جدوجہد کی ضرورت ہے اور سیاست بھی مغربی جمہوری طرز کی جس میں وہ بوجوہ ناکام ہوچکے ہیں۔ اس اپروچ کی وجہ سے یہ عناصر اس طرف توجہ نہیں دے سکے کہ نبی کریم ﷺ دنیا میں جو عظیم انقلاب لانے میں کامیاب ہوئے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ راہ عمل 'تعلیم کتاب وحکمت وتزکیۂ نفس' تھی یعنی دعوت وتبلیغ وتعلیم اور اصلاح وتربیت وتزکیۂ نفس اور ان کے لیے اختیار کردہ تعمیر سیرت کے تمام ذرائع۔ اب جب فرد کی تعمیر شخصیت کے مختلف ذرائع انہوں نے استعمال ہی نہیں کیے اور انہیں اچھا مسلمان اور اپنا ہم خیال بنایا ہی نہیں اور اسی وجہ سے انہیں سیاسی جدوجہد میں بھی کامیابی نہیں ملی تو ظاہر ہے اسلام 'نافذ' نہیں ہوسکا اور ہوگا بھی نہیں۔

۲۔ دوسری طرف اصلاحی وتبلیغی جماعتیں ہیں جو دین کو نماز روزے اور داڑھی پگڑی تک محدود سمجھتی ہیں۔ دین کا مکمل تصور کہ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے گوشوں کو محیط ہے، ان کے پیش نظر ہی نہیں تو سارا اسلام کیسے نظر آئے؟ ان ہی جیسا رویہ دینی مدارس کا ہے جو صرف 'مذہبی تعلیم' دیتے ہیں اور 'دنیاوی تعلیم' دینا اپنا دائرہ کار ہی نہیں سمجھتے۔ ان سے کوئی پوچھے کہ اسلام میں دین ودنیا میں تفریق کہاں سے آ گئی؟ اسلام تو ایک جامع دین ہے جس میں ساری انسانی زندگی کے لیے ہدایت ہے۔ تو جب دنیا کو دین کے مطابق گزارنا اور اس کے لیے افراد تیار کرنا

مدرسہ کی تعلیم کا ہدف ہی نہیں تو تبدیلی کیسے آئے؟ یہی حال تصوف کے حلقوں کا ہے۔

۳۔ تیسری طرف ہمارے حکمران اور حکمران طبقے (اسٹیبلشمنٹ) ہیں جو اسلام کا صرف نام لیتے ہیں اور سارا نظام زندگی مغربی تہذیب کے مطابق چلانا چاہتے ہیں۔ مغرب کی غالب تہذیب اور اس کے علمبردار طاقتور ممالک ان کی پشت پر ہیں۔

ان حالات میں قارئین کرام آپ ہی بتایئے کہ کس عقل ومنطق کی رو سے پاکستان میں اسلام آنا چاہیے؟ یا یہاں ریاستی قوت سے نافذ ہونا چاہیے؟

بقیہ: قانون واخلاق کا باہمی ربط

میری رائے میں مضمون کے آخر میں دیے گئے تعلیمی نظام کے متعلق پیراگراف حذف کر دیے جائیں تو بہتر ہے۔ یہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے جس پر ضمناً کلام کرنا مفید نہیں۔ مسلم دنیا میں تنویری علمیاتی منہج کا غلبہ صدیوں پرانا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ علمیاتی منہج جاہلیت خالصہ ہے لیکن اس منہج کو معطل کرنے کی حکمت عملی کی ترتیب اپنے ابتدائی مراحل میں ہے (اور لاہور کے ڈاکٹر محمد امین اس سلسلہ میں قیمتی کام کر رہے ہیں)۔ یہ حکمت عملی لازماً تزویراتی ہوگی۔ عملی طور پر جو مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ پوری مسلم دنیا میں یہی منہج نافذ العمل ہے۔ برصغیر کے علما نے اس منہج سے کلیتاً عدم وابستگی کا جو رویہ اختیار کیا تھا اس کے نتائج کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں رہے۔ اغماض کا یہ رویہ نہ اسلامی معاشرت کو محفوظ رکھ سکا نہ اقتدار اسلامی کے قیام کی راہ ہموار کر سکا۔ سوال یہ ہے کہ تنویری علمیاتی منہج کو کس طرح مسخر اور منتشر کیا جائے؟ کیا اسلامی معاشرہ کا اس تعلیمی نظام میں رہتے ہوئے اس منہج کی اصولی اور عملی تنقید مرتب کرنے کے علاوہ بھی ہمارے پاس کوئی معاشرتی آپشن ہے؟ کیا یہ درست نہیں کہ سرمایہ داری ایک نظاماتی کلیت ہے، ایک ایسی کلیت جس کے ہر جزو کی تسخیر اس کے اندرونی تضادات کو مہمیز دے کر ہی ہو سکتی ہے؟ کیا اس مفروضہ حقیقت سے سرمایہ دارانہ تعلیمی نظام کو مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے؟ اس قسم کے سوالات کے جواب ہم تلاش کر رہے ہیں۔

اسلام اور پاکستان

ڈاکٹر محمد امین
سیکرٹری جنرل ملی مجلس شرعی

ملی مجلسِ شرعی

مجلس کو سارے مکاتب فکر کی غیر سیاسی دینی جماعت بنانے کا فیصلہ کیوں کیا گیا؟

* ہر مسلمان، خواہ اس کا تعلق کسی بھی دینی مسلک، سیاسی جماعت، دعوتی تنظیم، دینی سیاسی جماعت یا ادارے سے ہو، وہ ملی مجلس شرعی کے ساتھ کام کر سکتا ہے۔

* ہم دین کا درد رکھنے والے سب افراد سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ملی مجلس شرعی کا ساتھ دیں

پس منظر

ملی مجلس شرعی سارے دینی مکاتب فکر کی مشترکہ علمی مجلس ہے جو ۲۰۰۷ء میں قائم کی گئی۔ تاسیسی اجتماع میں ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی (شہید) کو صدر اور راقم کو سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ تاسیسی اجتماع میں حافظ فضل الرحیم (جامعہ اشرفیہ)، مولانا زاہد الراشدی (جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانولہ)، مولانا عبدالرؤف فاروقی (جمعیت علماء اسلام [س])، مولانا مفتی محمد خاں قادری (جامعہ اسلامیہ لاہور)، حافظ عبدالغفار روپڑی (جماعت اہلحدیث)، حافظ عبدالرحمن مدنی (جامعہ رحمانیہ)، حافظ ارشاد الحق اثری (ادارہ اثریہ فیصل آباد) اور مولانا عبدالمالک (جمعیت اتحاد العلماء) موجود تھے۔ بعد میں اہل تشیع کو بھی مجلس میں شامل کر لیا گیا۔

مجلس کے پیش نظر دو بڑے اہداف تھے۔ ایک مختلف مسالک کے درمیان یکجہتی اور قربت کا ماحول پیدا کرنا اور دوسرے معاشرے کو درپیش مسائل میں سب مسالک کی طرف سے متفقہ مؤقف اختیار کرنا۔ الحمدللہ! مجلس پچھلے چودہ سال سے یہ کام کرتی آ رہی ہے، بہت سے موضوعات پر رپورٹیں تیار کر کے اس نے اہل علم اور حکومتی و عدالتی حلقوں کو بھجوائی ہیں اور اس کے اجلاس باقاعدگی سے ہوتے رہے ہیں۔

توسیع کی ضرورت

حال ہی میں دیکھا گیا کہ دینی سیاسی جماعتیں اپنے اہداف میں مصروف ہیں۔ دعوتی

واصلاحی تحریکیں، دینی مدارس اور تصوف کے حلقے بھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں لیکن معاشرہ اخلاقی بحران کا شکار ہے۔ فحاشی، عریانی، زنا بالجبر و بالرضا عام ہے۔ چوری، ڈکیتی، فراڈ، کرپشن، بددیانتی روزمرہ کا معمول بن چکا ہے۔ میڈیا اور مخلوط تعلیم نے تباہی مچا رکھی ہے۔ حکومت پے در پے غیر اسلامی اقدامات اور قانون سازی کر رہی ہے۔ حال ہی میں اوقاف بل پاس کیے گئے جن کو اگر نافذ کیا جائے تو پاکستان کا کوئی مدرسہ اور مسجد آزادانہ کام نہ کر سکے گی۔ گھریلو تشدد بل کے نام پر اسلامی معاشرت کو تباہ کرنے والا قانون پاس کر دیا گیا، سندھ حکومت نے قانون پاس کر دیا کہ اشاعت اسلام جرم ہے۔ یہ قانون مرکز میں بھی پاس کرایا جانے والا ہے لیکن ان برائیوں کے خلاف کام کرنے کے لیے میدان میں کوئی قوت موجود نہیں۔

لہٰذا مجلس کے ذمہ داروں نے سوچا کہ ملی مجلس شرعی کے کردار پر نظر ثانی کی جائے۔ وہ اپنا موجودہ علمی کام بھی جاری رکھے لیکن ساتھ ہی دینی مقاصد کے لیے حصول کے عملی جدوجہد بھی کرے۔ اس کے پیش نظر کوئی سیاسی مقاصد نہ ہوں، نہ وہ کبھی الیکشن میں حصہ لے اور وہ پہلے کی طرح سارے مسالک اور مکاتب فکر کی نمائندہ ہو۔ یہ بحث اس کے اجلاسوں میں چلتی رہی اور بالآخر ۱۹ر جولائی ۲۰۲۱ء کو مجلس نے اتفاق رائے سے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا۔

اس موقع پر راقم نے پیشکش کی کہ حنفی بریلوی مکتبہ فکر کی کسی بڑی شخصیت کو ناظم اعلیٰ بنا دیا جائے تا کہ مجلس دینی مکاتب فکر کی مؤثر نمائندگی کا مظہر بن سکے۔ مجلس نے راقم کے اس جذبے کو سراہا اور مناسب آدمی کے ملنے تک کام جاری رکھنے کے لیے کہا۔

مجلس کے جو مقاصد اور طریق کار طے کیا گیا ہے وہ درج ذیل ہے:

مقاصد واہداف

- اسلامیان پاکستان میں موجود مختلف دینی مکاتب فکر کے درمیان یکجہتی، ہم آہنگی اور اتحاد کو فروغ دینا۔

- مختلف دینی مکاتب فکر، ان کے مختلف گروہوں، جماعتوں، تنظیموں، اداروں اور اہم شخصیات کو زیادہ سے زیادہ ملی مجلس شرعی کے پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنا۔

- دینی تعلیمات و مفادات کے خلاف پیش آنے والے مسائل پر علمی رہنمائی اور اُن کو

تحریکی انداز میں حل کرنے کی کوشش کرنا۔

۔ مشترکات کی بنیاد پر مسلم فرد، معاشرے اور ریاست تک اسلامی تعلیمات پہنچانا اور انہیں عمل کی ترغیب دینا۔مشترکات پر مبنی غیر اسلامی افکار واعمال کی اصلاح کی کوشش کرنا خصوصاً مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب کے باطل نظریات واثراتِ بد کورد کرنا۔

طریقِ کار

۔ مجلس اسلامی حدوداور آئین پاکستان کے اندر رہتے ہوئے پرامن جدوجہد کرے گی۔

۔ مجلس مساجد کو مرکز بنا کر سارے مسالک کے علماء پر مشتمل کمیٹیوں کے ذریعے (جن میں مقامی دین دار پروفیشنلز [مختلف شعبوں کے ماہرین] کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے) مندرجہ ذیل کاموں کو منظم کرے گی:

ہنگامی مسائل: ہنگامی مسائل میں حسب ضرورت تحرک جیسے پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا میں بیانات،، کانفرنسیں، سیمینارز، پریس کانفرنسیں، ریلیاں، جلسے، جلوس وغیرہ۔

مستقل نوعیت کے نظریاتی کام

i۔ علمی کمیٹی (ملی اور قومی سطح پر پیش آمدہ نظریاتی اور سماجی مسائل کے لیے مختلف مکاتب فکر کے اہل علم نمائندوں پر مشتمل ہوگی ۲۔اس کمیٹی میں پیش نظر موضوع پر مواد کی جمع وتدوین کے بعد اہم تحقیقات کو حسب ضرورت شائع بھی کیا جائے گا ۳۔اس کمیٹی کے ذریعے قومی سطح کی مشاورت میں مؤثر حصہ لیا جائے گا)۔

ii۔ مشترکات پر مبنی خطبات جمعہ کی تیاری وتقسیم

iii۔ مشترکات پر مبنی دعوت واصلاح کا کام،عوام وخواص کے لیے

vi۔ مساجد کو مرکز بنا کر مندرجہ ذیل کام کرنا:

۔ 'فلاحی کمیٹی' کا قیام: تاکہ محلے اور علاقے کے خوشحال گھرانوں کی مالی اعانت سے مقامی یتیموں، بیواؤں اور مساکین کی مالی مدد کی جاسکے تاکہ کوئی بھوک سے خودکشی نہ کرے اور بھوکا نہ سوئے۔

۔ 'مصالحتی کمیٹی' کا قیام: جو چھوٹے معاملات ومقدمات میں شریعت کے مطابق فیصلے

کرے، فریقین میں ثالثی اور مصالحت کرائے۔

- 'خدمت خلق کمیٹی' جو مقامی عوامی مسائل کے حل کے لیے کوشاں ہو جیسے گلیوں کی صفائی ، پانی کی فراہمی، گٹر بند ہو جانا، سٹریٹ لائٹ نہ ہونا وغیرہ۔

- 'امن وامان کمیٹی': سٹریٹ کرائمز کو روکنا، گلی محلے میں چوکیدار کی تعیناتی ، پہرے کا انتظام، مقامی مذہبی اختلاف وخلفشار کو روکنا۔

- 'تجارتی کمیٹی': 'اخوت' کی طرز پر چھوٹے تاجروں، ریڑھی والوں وغیرہ کو قرض حسن کی فراہمی، بلاسود تجارت کو فروغ دینے کے اقدامات۔

اس وضاحت کے بعد ہم ملت کے دردمند عناصر سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ملی مجلس شرعی کا ساتھ دیں تا کہ پاکستان کو درپیش دینی واخلاقی بحران کے مداوہ کے لیے مشترکہ کوششیں کی جاسکیں، افراد کو اچھا مسلمان بننے میں مدد دی جائے اور اجتماعی زندگی کو بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العٰلمین.

اپنے من میں ڈُوب کر پا جا سراغِ زندگی
تُو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

مَن کی دُنیا میں نہ پایا مَیں نے افرنگی کا راج
مَن کی دنیا میں نہ دیکھے مَیں نے شیخ و برہمن

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تُو جھکا جب غیر کے آگے، نہ من تیرا نہ تن

(اقبال)

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر ابصار احمد [1]

ہماری درسگاہوں میں 'العلم' کا فقدان

قرآن کریم کی دو آیات: "فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" [محمد:۱۹] اور "فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ" [الانفال:۴۰] کے حوالے سے واضح ہے کہ ہمارے دینی تصورات میں اللہ تعالیٰ کے وجود کا عقیدہ پختہ علم اور تفصیلی دلائل کی روشنی میں ہونا ضروری ہے تاکہ اس عقیدے کے ثمرات ظاہر ہوں، اس میں شک کا خلجان اور نفس کا تردّد نہ رہے اور یہ ایمان اور عقیدہ جویانِ حق اور تشنگانِ علم کے وجودی احوال میں متحقق ہو کر ان کے اخلاق و اعمال کو نہ صرف قرآن و سنت کے قالب میں ڈھال دیں بلکہ وہ دینی تعلیمات و اقدار کے داعی بھی بن جائیں اور اس طرح تہذیب اور معاشرے کی سطح پر حقیقی اور دیرپا تبدیلی کا باعث بنیں۔ محولہ بالا دونوں آیات میں اللہ تعالیٰ کے بطور الٰہ، مولیٰ اور معبود کا علم حاصل کرنا صیغہ امر میں آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ از روئے قرآن اللہ کو خالق و مالک اور معبود و مسجود ماننا پورے تیقن اور علم و عرفان کی روشنی کے ساتھ تاکیداً مطلوب ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہمارے دینی معتقدات اندھے اور بے عقل تصورات (Dogmas) نہیں، بلکہ تعقل، بصیرت و عرفان اور فقہ عمیق پر مبنی ہیں جو تنزیل ربانی کی تابانی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ یہ محض محدود انسانی حواس اور استنباطی عقل کے زائیدہ نہیں ہیں۔ قرآن و سنت سے کشید کردہ علم ہی ہمارے سلف صالحین کے نزدیک 'العلم' ہے، یعنی صحیح اور مکمل معنوں میں علم "العلم" ہی ہے جبکہ انسانی حیاتِ دنیوی کے مسائل، تفہیم اور ان کے حل کے ذرائع و وسائل کی دریافت و تدریس محض علم بلکہ اس سے بھی کم تر فنون یا مہارتوں (Skills) کے درجے کی چیزیں ہیں جن سے باطنی نور، حکمتِ خالدہ اور علمِ حقیقی کا سرے سے کوئی واسطہ نہیں۔

دین اسلام کے دو بنیادی اور اہم تر مآخذ قرآن اور سنت رسول ﷺ میں علم ہی کے لیے دوسرا کلمہ/ لفظ "ہدایت" استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جانے والی سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ سے ہماری دعا ہدایت "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کی ہوتی ہے۔ یعنی "ہماری دعا ایسے علم نافع یعنی ہدایت کے لیے ہوتی ہے جو ہمیں سیدھے راستے پر چلاتے ہوئے اخروی

[1] سابق صدر شعبہ فلسفہ، پنجاب یونیورسٹی و مدیر سہ ماہی 'حکمت قرآن' لاہور

صلاح وفلاح اور سعادتِ ابدی تک لے جائے۔ سورۃ الفاتحہ کے فوری بعد سورۃ البقرۃ کی دوسری آیت میں الکتاب یعنی قرآن کریم کو ایسی کتاب قرار دیا گیا جو ریب وشک سے مبرّا اور متقین کے لیے ہدایت ہے۔ علم کے متبادل ہدایت کے لفظ سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ دین میں ایسا نظری علم جس کا عمل سے کوئی تعلق نہ ہو مطلوب وپسندیدہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کلاسیکل دینی لٹریچر میں محمود اور مذموم علوم کی تفریق پائی جاتی ہے اور خود نبی کریم ﷺ نے علم کے ضمن میں علم ضار کی بجائے علم نافع کی دعا کی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے تناظر میں یہ ممکن نہیں کہ بُرے اخلاق کے حامل طالب علم کو وہ حقیقی علم حاصل ہو جائے جو راہِ آخرت میں نفع پہنچا سکے یا جس سے ابدی سعادت حاصل ہو سکے۔ بُرے اخلاق کے حامل جو علم حاصل کرتے ہیں وہ محض رسمی علم ہوتا ہے جو کبھی زبان پر رہتا ہے اور کبھی دل میں بھی اس کا اعادہ وتکرار ہو سکتا ہے، تاہم علم حقیقی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ علم کثرتِ روایت کا نام نہیں بلکہ یہ ایک نور ہے جو اللہ دلوں میں القاء کر دیتا ہے۔ بعض اکابر صلحاء کا قول ہے کہ علم صرف خوفِ الٰہی کا نام ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ"[فاطر:۲۸]

"اللہ سے اُس کے بندوں میں سے صرف علماء ڈرتے اور لرزاں وترساں رہتے ہیں۔"

جن حضرات نے علم کو خوفِ الٰہی سے تعبیر کیا ہے انہوں نے علم کے اصول اور حقیقی نتیجہ کی نشاندہی کی ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کو جتنا زیادہ جانے گا یعنی عرفانِ حق رکھے گا، اتنا ہی زیادہ خوفِ وخشیت الٰہی رکھے گا۔ حضرت سفیان ثوریؒ کے اس جملے کا بھی یہی مفہوم ہے: "تعلمنا العلم لغير الله فابى العلم ان يكون الا الله" "ہم نے اللہ کے علاوہ کے لیے علم حاصل کیا مگر علم نے اس سے انکار کر دیا کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی کے لیے ہو۔"

بعض محققین حضرات اس جملے کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہمیں صرف ظاہری الفاظ وعبارت کا علم آیا، اس کی حقیقت نیت میں اخلاص کی کمی کے باعث ہم پر واضح نہیں ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سے علماء تحقیق اور فقہائے دین فروع واصول میں تفوق ومہارت رکھنے کے باوجود مذموم عادتیں رکھتے ہیں، لیکن ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جس علم میں ان کا اشتغال ہے وہ علم ہونے کی حیثیت سے مفید نہیں ہے۔ اس علم کا فائدہ صرف اس صورت میں ہے جب اس کی طلب اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور حصول کا مقصد اللہ تعالیٰ کا قرب اور سعادتِ اُخروی ہو۔

سطورِ بالا کی روشنی میں اگر ہم وطن عزیز کے دینی اور سیکولر دونوں قسم کے مدرسوں اور جامعات کی صورت حال کا جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ صورتِ حال بڑی مخدوش اور خوفناک ہے اور ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ جدیدیت اور لبرل ازم کے افکار اور کمرشل ترجیحات سے ہماری درسگاہوں میں تعلیم کا معیار دن بدن روبہ زوال ہے۔ سائنس اور تکنیکی علوم کا معاملہ ذرا مختلف ہے (اگرچہ وہ بھی ہمارے نقطۂ نظر سے نیوٹرل اور Value-free نہیں ہوتے۔) لیکن ماڈرن سوشل سائنسز اور سماجی علوم نے جو اکثر و بیشتر مغرب کی پروردہ اور الحاد اور کیپٹل ازم کے بطن سے تولد ہوئی ہیں، ہمارے معاشرے کے تعلیم یافتہ افراد کے اذہان کو دین ومذہب اور اس کی متوارث روایت سے بالکل برگشتہ کر دیا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کی ایلیٹ یونیورسٹیاں ابھی تک کولونیل دور کی سامراجی پالیسیوں پر چل رہی ہیں اور صرف انگریزی زبان ہی نہیں بلکہ مختلف سماجی علوم میں نظریات اور افکار بھی وہ پڑھا رہی ہیں جو ہمارے طالب علموں کو اپنی علمی روایت اور شاندار ماضی سے نہ صرف بالکل ناواقف رکھتی ہیں بلکہ انہیں اپنی تہذیب وتمدن اور اس کی اساسات کے حوالے سے شدید ذہنی احساسِ کمتری (Inferiority complex) میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ سیکولر سماجی علوم میں انسان کے لیے جو آئیڈیل پیش کیا جاتا ہے وہ مختصراً یہ ہے کہ لذتوں سے متمتع ہونے کا Optimum method کون سا ہے؟ قومی سطح پر اس لذتیت پرست فلسفہ حیات اور بالکل آزاد اور مادہ پرستانہ معاشی تگ ودو (Rat race) کے انتہائی بھیانک اثرات ہم اپنے معاشرے میں بڑے پیمانے پر دیکھ رہے ہیں۔ جنسی درندگی وشہوت پرستی اور تمام اخلاقی حدود سے ماورا دولت اور عیاشی کے ذرائع کا حصول مغربی فکر اور طرزِ معاشرت کے دلدادہ حضرات وخواتین کا واحد مقصدِ حیات ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ برصغیر کے استعماری دور میں لارڈ میکالے کا تجویز کردہ تعلیمی پروجیکٹ آزادی کے قریباً پون صدی بعد تک ہماری نام نہاد ''اسلامی جمہوریہ'' میں جاری وساری ہے اور برگ وبار لا رہا ہے۔ ہم نے نہ صرف کولونائزر کی زبان کا مقامی زبانوں اور قومی زبان پر سرکاری سطح پر برتر رکھا ہے بلکہ اس زبان کے ساتھ آنے والی اقدار، افکار اور رویّوں کو بھی ترجیح دی ہے اور سماجی حیثیت کی علامات کے طور پر ذہناً مقدّم رکھا ہے۔ اور اس کی وکالت اور تشہیر ہمارا پرنٹ میڈیا، ٹی وی چینلز اور سوشل میڈیا بڑے مؤثر اور رنگین انداز میں کرتے ہیں۔ نیوکولونیل امپیریلسٹ عالمی فکر کے مطابق مغربی (یورپ اور امریکہ) افکار اور تہذیب وکلچر کو عالمی سطح پر فوقیت اور مرکزیت حاصل ہے۔

لاہور کی ایک فاضل خاتون مریم سکینہ جو دینی علم کے ساتھ ساتھ شعائر اسلام (مثلاً حجاب) کی پابندی کرتی ہیں[۱] اپنے تجربات بیان کرتی ہیں اور شاکی ہیں کہ C I E Cambridge Internationl Examination کے پاکستان سٹڈیز (تاریخ) کے مضمون کے نصابات میں پاکستان اور ساؤتھ ایشیاریجن کے معروضی اور زمینی حقائق اور سامراجی طاقتوں کی زیادتیوں پر مبنی اہم تاریخی واقعات کا قطعاً کوئی حوالہ نہیں ہوتا۔ سوشیالوجی کے مضمون میں ابن خلدون اور دوسرے مسلم فضلاء کے عمرانی خیالات کا ذکر بالکل غائب اور تمام عمرانی افکار کا ماخذ اور آغاز یورپی تحریک تنویر (Enlightenment) کو قرار دیا جاتا ہے۔ راقم قارئین سے درخواست کرتا ہے کہ وہ محترمہ مریم سکینہ کا ''Decolonizing Education'' کے عنوان سے لکھا ہوا مختصر مضمون ضرور پڑھیں جو ہفت روزہ ''ندائے خلافت'' (شمارہ نمبر ۲۹) میں حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ یہ وقیع اور تجزیاتی تحریر خاص طور پر ان والدین کے لیے چشم کشا ہوگی جن کے نوعمر بچے سماجی سٹیٹس کے دباؤ کے تحت مشہور اور مہنگے انگلش میڈیم سکولوں میں زیر تعلیم ہیں اور ان میں دی گئی تعلیم طلبہ اور طالبات کو اپنے دین و مذہب اور درخشندہ تاریخ سے بالکل ناواقف رکھ کر ذہنی طور پر کاٹ دیتی ہے۔ چنانچہ راقم کا احساس ہے کہ ہم بطور ملّت اس وقت حد درجہ پُرآشوب اور قیامت آثار دور سے گزر رہے ہیں۔ تشکیک اور الحاد کے مرض میں پڑھے لکھے نام نہاد مسلمانوں کی بڑی تعداد مبتلا ہے۔ چند رسوم کو بغیر حقیقی فہم اور بے جان انداز میں ادا کر کے وہ بڑی مشکل سے ''کلچرل مسلم'' کہلانے کے لیے کوالیفائی کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں بعض اسلام پسند، ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات نے علم اور تعلیم و تدریس کے موضوع پر خاصا کچھ لکھا ہے۔ ان میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر شاہد صدیقی صاحب کا ہے جو لاہور کی کئی اہم درسگاہوں میں تدریسی تجربے کے بعد علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور وہاں سے ریٹائر ہوئے۔ میرے علم میں تعلیم کے موضوع پر ان کی کوئی مبسوط کتاب تو نہیں، لیکن گزشتہ آٹھ دس ماہ کے دوران متعدد اخباری کالموں میں انہوں نے اپنے خیالات و تجزیے پیش کیے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا ویسٹرن مراجع کا مطالعہ بہت وسیع ہے، اور انہوں نے برصغیر میں فرنگی اقتدار کے دو ہتھکنڈوں کے بارے میں بالکل صحیح اور تفصیل سے لکھا

[۱] اور جو خود GCE/IGCSE سسٹم اور نصابات میں پڑھی ہیں اور پھر ایم فل لیول تک انٹرنیشنل ریلیشنز میں تعلیم یافتہ ہیں، اور طویل عرصہ خود انگریزی میڈیم اداروں میں سوشل سائنسز کے مضامین کی تدریس کی ہے۔

ہے کہ ایک طرف جہاں برطانوی استعمار نے جبر کے ہتھکنڈوں سے جسم تسخیر کیے وہیں تعلیم کے ذریعے لوگوں کو ذہنی اور کلچرل غلامی کے جال میں پھنسایا۔ اطالوی دانشور انتونیو گرامچی کے حوالے سے وہ وضاحت کرتے ہیں کہ بالادستی کے لیے پولیٹیکل سوسائٹی اور سول سوسائٹی دونوں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ اوّل الذکر طاقت کا استعمال کرتی ہے جبکہ سول سوسائٹی طاقت کے استعمال کے بغیر ذہنوں کو تسخیر کرتی ہے۔ اس میں تعلیم ذہنوں پر قابو پانے کا ایک مضبوط ذریعہ بن جاتی ہے۔

ڈاکٹر شاہد صدیقی کی تحریریں اس حد تک تو مفید ہیں کہ وہ تعلیمی اداروں کے لیے اس ہدف کے ناقد ہیں کہ ان سے ایسے طلبہ نکلیں جن کا مطمحِ نظر صرف ملازمت کا حصول اور معیارِ زندگی بلند کرنے کی دوڑ میں شامل ہونا ہو اور وہ تہذیبِ نفس اور معاشرے کی بہتری کے جذبے سے بالکل خالی ہوں۔ وہ اس ضمن میں کرٹیکل تھنکنگ کی مہارت پر زور دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں نئے مسائل کے حل کے لیے پرانے حل متروک ہو چکے ہیں، اور مسائل کا نئے زاویوں سے جائزہ لینا ضروری ہے اور تسلیم شدہ باتوں کو من وعن ماننے کے بجائے ان پر سوالات اٹھانے ضروری ہیں۔ تاہم دینی خانوادے سے تعلق رکھنے کے باوجود ان کا ذہن ان تحریروں میں قرآن وسنت، عقائد اور مسلمان مشاہیر سے ملنے والے تراثِ علمی کی طرف نہیں گیا جس کی سطحی تدریس بھی ہمارے تعلیمی اداروں میں نہ ہونے کے برابر ہے اور طلبہ کے اخلاقی وروحانی وجود میں مثبت تبدیلی (Transformation) کا رول کسی درجے میں بھی ادا کرنے سے قاصر ہے۔ کرٹیکل اور ناقدانہ نظر سے پہلے ہماری نوجوان نسل میں دین ومذہب کے ثوابت اور یقینی امور کا علم اور ذہنی وقلبی وابستگی از حد ضروری ہے۔ اس کے بغیر ان کی تنقیدی نگاہ صرف منفی اثرات پیدا کرے گی۔ کلاس روم سے باہر نوجوان نسل میڈیا سے اثر قبول کرتی ہے، اور بظاہر سچ کا یہ بیوپاری میڈیا غیر جانبدار (Neutral) نہیں ہے بلکہ مکمل جانبدار ہے۔ یہ صرف اور صرف آزادی کے عقیدے کی وکالت کرتا ہے اور یہ میڈیا 'دین' اور 'اخلاق'، 'مذہب'، 'روایت'، 'اقدار' اور اجتماعیتوں/ عاقلہ سب کا مشترکہ دشمن ہے۔

بحمداللہ اُمت مسلمہ کی تاریخ میں علوم دینیہ کو اپنی اصل سپرٹ اور مفہوم میں پیش کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انتظام کیا جاتا رہا ہے۔ احیائے دین اور مسلم فکریات کو روشن اور جاری رکھنے کے عمل میں سیکڑوں مشاہیر اہل علم نے حصہ لیا، جن میں سے بعض کو اپنی بصیرت وتفقہ اور جامعیت کے سبب خصوصی مقام حاصل ہے۔ اس سنہری زنجیر میں دو نام بہت ہی نمایاں ہیں: امام

غزالیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ۔ راقم اس مختصر شذرے میں صرف اوّل الذکر کے بارے میں چند سطور قلم بند کر رہا ہے۔

حجۃ الاسلام ابو حامد غزالیؒ (متوفی ۵۰۵ھ) کی عربی تصنیف ''احیاء علوم الدین'' ان کی بیسیوں کتابوں میں سے اہم ترین، مشہور زمانہ اور زندۂ جاوید کتاب جو کسی تعارف کی محتاج نہیں، اہل علم کے ہاں معروف ہے۔ یہ عقائد، اَسرارِ شریعت وطریقت، اخلاق وتصوف، فلسفہ ومذہب، حکمت وموعظت، اصلاحِ باطن اور تزکیۂ نفس کا ایسا حسین شاہکار ہے جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ پوری کتاب (اصل عربی اور تراجم بھی) ایسے مؤثر اور عام فہم انداز میں لکھی گئی ہے کہ کوئی شخص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس کتاب کو ہر زمانہ اور ہر طبقہ میں قبولِ عام رہا ہے۔ بے شک یہ کتاب اپنی خصوصیات میں بے نظیر و بے مثال ہے۔ اہل سنت کے عقائد اور بیانیے کا کینن (Canon) بننے والی ضخیم کتاب امام غزالیؒ کی احیاء العلوم ہی ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ انسائیکلوپیڈیائی کتاب اسلام کا ایک انتہائی معقول، دلکش، جامع اور عظیم الشان بیانیہ ہے جو مغربی جدیدیت سے کم وبیش پانچ صدیاں قبل لکھا گیا لیکن اس کے موضوعات اور مندرجات کی اہمیت (Relevance) اور افادیت آج کے دور کے لیے بھی ہے۔ امام غزالیؒ کی دینی حقائق میں گہری بصیرت، بالغ نظری، غیر معمولی ذہانت اور بے کنار تخلیقی استعداد ہر باب اور ہر فصل میں عیاں ہے۔ یہ وہ کتاب ہے کہ جس کو ایک طرف تو ائمہ اسلام الہاماتِ ربانی سمجھے، دوسری طرف ہنری لوئیس نے ''تاریخ فلسفہ'' میں اس کی نسبت لکھا کہ:

''اگر ڈیکارٹ (جو یورپ میں فلسفۂ جدید کا بانی خیال کیا جاتا ہے) کے زمانے میں احیاء العلوم کا ترجمہ فرنچ زبان میں ہو چکا ہوتا تو ہر شخص یہی کہتا کہ ڈیکارٹ نے احیاء العلوم کو چرالیا ہے۔''

مقام حیرت ہے کہ امام غزالیؒ جن کی سو کے لگ بھگ انتہائی قیمتی اور فکر انگیز موضوعات پر تصنیفات ہیں اور جن میں احیاء علوم کا پہلا باب علم کے بیان اور اس کی فضیلت اور پھر آخری ابواب میں سے ایک 'بیان فی شرف العقل' ہے، ان پر عقل دشمنی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے علماء آخرت کو علمائے دنیا اور علمائے سوء سے ممتاز کیا ہے اور اسی طرح عقل معاد کو عقل معاش سے علیحدہ کیا ہے، اور علم کے لیے ادب، اخلاق اور اخلاصِ نیت کو بھی ضروری قرار دیا ہے، لیکن یہ سب تصریحات قرآن وسنت اور روایت سے مستفاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ احیاء علوم

کے ہر باب کا آغاز آیاتِ قرآنیہ، احادیث اور روایات کے بیان سے کرتے ہیں۔ غزالیؒ نے قرآن مجید کے فطری اور سادہ طرزِ استدلال کو اُجاگر کیا ہے جس کو ان کے خیال میں فلاسفہ اور عقلاء نے بگاڑ کر جدل اور ممارات کا دروازہ کھول دیا جبکہ فی الحقیقت 'قلب' توحید کا معدن اور منبع ہے۔ اقوالِ لسان اور عمل جوارح کی طرح اقوال القلب اور اعمال القلب 'عبادت' کی تشریح و تنقیح میں اہمیت کے حامل ہیں۔ جملہ مراسم عبودیت میں اصل حقیقت اعمالِ قلوب مثلاً اخلاص، انابت، خشوع و خضوع، تبتّل اور خشیت کی ہے۔ قرونِ اولیٰ والی عبادت کی جامعیت اور ماثور روایتی تعبیر بھی اُمت مسلمہ کے اذہان میں واضح اور روشن تھی، چنانچہ چند صدیوں بعد مغلوبیت اور استعمار کے گہرے منفی اثرات والی صورتِ حال ابھی سامنے نہ آئی تھی۔ اس میں کسی کو بھی شک نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اُس کی شریعت پر عمل کرنے سے متحقق ہوگی۔ اور چونکہ نظام اجتماعی پر بھی اہل حق غالب تھے، اسی لیے تعبیر دین میں بھی نئی شکلیں (Variants) یا اختلافی آراء سامنے نہیں آئی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ امام غزالیؒ کی جامع اور گمبھیر شخصیت میں کلامی، استدلالی (فلسفیانہ)، صوفی، فقہی اور روایتی، غرضیکہ تمام جہتیں اکٹھی جمع تھیں اور ایک اعتبار سے وہ یکتا اور منفرد شخصیت تھے جس کے سبب انہیں امت نے حجۃ الاسلام کا لقب دیا۔

امام غزالیؒ کی شخصیت اور افکار سے عالم اسلام کے علمی اور راسخ العقیدہ حلقے ہی متاثر نہیں ہوئے بلکہ یورپ اور امریکہ کی اکیڈیمیا کے پروفیسر حضرات نے بھی نہ صرف ان میں دلچسپی لی، بلکہ انہیں اپنے مطالعات اور ریسرچ کا موضوع بنایا۔ علاوہ ازیں متعدد نومسلم جنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد قرآن وحدیث، اسلامی علوم اور عربی زبان ولٹریچر کے مطالعے میں طویل عرصے سخت محنت کی، ان میں سے بھی اکثر نے امام غزالیؒ کی تصنیفات میں بہت دلچسپی لی اور ان پر انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں میں تحقیقی کام کیا۔ ان میں عمر فاروق عبداللہ، عبدالحکیم مراد، حمزہ یوسف اور کئی دوسرے بہت نمایاں ہیں۔ چنانچہ احیاء علوم جہاں مدارس کے تعلیم یافتہ کے لیے دورِ جدید کے فتن، کفر والحاد اور تشکیک وارتیاب کو سمجھنے میں معاون ہے وہاں جدید تعلیم یافتہ افراد کے لیے 'علم الکلام' کے اصول، منہج اور مباحث سے تعارف کا بھی عمدہ ذریعہ ہے۔ خصوصاً ڈاکٹر عمر فاروق عبداللہ کے لیکچرز میں قرآن وحدیث کے مسلسل حوالے گہری مذہبیت کی ایک تابندہ علامت ہیں۔ عقائد کے مباحث میں ان کے ہاں تدقیق اور تعمیق اور ساتھ ہی ظاہری وضع قطع اور

لباس میں اسلامیت مسحور کن ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ مغرب روحانیت سے اب بہت دُور اور خالی (Spiritually Unmusical) ہے لیکن وہاں مذہبی اور روحانی موضوعات پر بڑے پیمانے پر لٹریچر چھپ رہا ہے اور بک شاپس کے علاوہ لائبریریوں میں بھی مطالعے کے لیے موجود ہے۔

افکارِ غزالیؒ کا بنظرِ غائر مطالعہ کسی اعتبار سے بھی منجمد تصورات کو قارئین میں منتقل نہیں کرتا بلکہ قلب سلیم میں موجود حکمت خالدہ کے نکات شعور کی سطح پر ابھار کر انسان کے اخلاقی اور روحانی وجود کو اسلام کے قرنِ اوّل کی زندگی روایت کی شکل میں بلند کرتا ہے اور علم حقیقی اور اقدار کی بازیافت فراہم کرتا ہے لیکن افسوس وقلق کے ساتھ اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ ''مدرسہ ڈسکورس'' کے مؤسس اور روحِ رواں پروفیسر ابراہیم موسیٰ جنہوں نے جدیدیت اور پس جدیدیت کے منفی انداز اور بے معنی بلکہ تباہ کن وادی کو جو ذہنی جولانگاہ بنالیا ہے، انہیں امام غزالیؒ کی تصنیفات ایک حنوط شدہ مردہ روایت کی بازگشت محسوس ہوتی ہیں۔ نارتھ کیرولینا پریس کی طرف سے ۲۰۰۵ء میں شائع شدہ اپنی کتاب Ghazali and the Poetics of Imagination میں وہ اس رائے کا اظہار Mummification of Tradition کے الفاظ سے کرتے ہیں جو ہر اعتبار سے اسلام کی ساڑھے چودہ سو سالوں میں محیط شاندار اور زندہ ومتحرک تسلسل وروایت پر انتہائی مضحکہ خیز اور ناروا، غلط اور طفلانہ تبصرہ ہے۔

قرآن اکیڈمی کے سکالر اساتذہ ڈاکٹر رشید ارشد اور مؤمن محمود، دونوں نے امام غزالیؒ سے وسیع علمی اخذ واکتساب کیا ہے۔ یہ عربی زبان کے جوہر شناس، عقائد اور عقل ونقل میں اختلاف اور تطبیق وترجیح کے مباحث میں دلچسپی رکھنے کے ساتھ امام غزالیؒ کا دینی مصلح اور رہنما کی حیثیت سے مطالعہ کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں اساتذہ کا علم، فہم اور خوش بیانی حیرت انگیز ہے۔ انہوں نے تفہیم وتنقید فکر جدید کو مسلسل جاری رکھنے کے لیے ''غزالی فورم'' کا آغاز بھی کیا ہے۔ دعا ہے کہ دینِ متین کے احیاء کے لیے یہ علمی کاوشیں بارآور ہوں اور اللہ تعالیٰ انہیں شرفِ قبولیت سے نوازیں۔ آمین یاربّ العالمین! (بشکریہ 'حکمت قرآن')

تعلیم و تربیت سید خالد جامعی

تعلیم اور عالمی استعمار

جدید تعلیم علاقائی، جغرافیائی اور حقیقی معیشت سے فرد کا رشتہ توڑ کر اسے آفاقی معیشت کا خواب دکھاتی ہے جس میں انسان کسی صنعت یا سروس سیکٹر میں غلامی کا فریضہ انجام دیتا ہے اور اس پر راضی رہتا ہے۔ آفاقیت کے نام پر یہ عالمی کالونائزیشن (Universal Colonization) کا منصوبہ ہے جس کی کسی سطح پر کوئی مزاحمت نہیں۔

جدید انسان یہی سمجھتا ہے کہ دفتر کے بغیر کام نہیں ہوسکتا، گاڑی کے بغیر سفر ممکن نہیں، صابن کے بغیر صبح نہیں ہوسکتی، ٹوتھ پیسٹ کے بغیر دانت کیسے صاف ہوں گے اور میٹرنٹی ہوم کے بغیر بچے کیسے پیدا ہوں گے کیونکہ وہ اپنی تاریخ، تجربے، زمان و مکان کا قیدی ہے، اس سے ماورا ہو کر سوچ ہی نہیں سکتا۔ حالانکہ تاریخ کے دو پیغمبر قرآن حکیم کے مطابق میٹرنٹی ہوم کے بغیر پیدا ہوئے۔ حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور آخری پیغمبر کی ولادت بھی تاریخ کے مطابق میٹرنٹی ہوم کے بغیر ہوئی۔ آج بھی دنیا میں اربوں جانور، پرندے، درندے، چرندے، حشرات الارض، ہاتھی اونٹ کے بڑے بڑے بچے بھی فطری طریقے سے میٹرنٹی ہوم کے بغیر پیدا ہوتے ہیں۔ جدید سیکولر تعلیم آپ کے سوچنے سمجھنے کے پیمانے بدل دیتی ہے حتیٰ کہ آپ کے سونے جاگنے کے اوقات، کھانے پینے کی عادتیں، محبت و نفرت کے پیمانے بلکہ آپ کے خواب، خیال، تصورات، اقدار، روایات حتیٰ کہ خوشبو اور بدبو کے پیمانے بھی بدل دیتی ہے۔

کراچی میں آپ کسی بچے کو دیسی گھی کھلائیں تو وہ کہے گا اس گھی سے بدبو آرہی ہے کیونکہ اس بچے نے ڈالڈا کا نقلی گھی کھایا ہے جو خوشبو سے خالی ہوتا ہے۔ مغربی نظام تعلیم ہمیں سب سے زیادہ ناقص بنا رہا ہے، یہ پوری دنیا کے لوگوں کو عالم گیر سطح پر یکساں وسائل کے استعمال کی تبلیغ کرتا ہے اور اس میں ان وسائل کو کلی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے جو مختلف معاشروں کو ان کے ماحول سے قدرتی طور پر ملتے ہیں۔

جدید تعلیم سب سے پہلا کام یہ کرتی ہے کہ وہ دنیا کی ہر تہذیب، معاشرت، مذہب کی

مابعدالطبیعیاتی اساسات کو بدلتی ہے تا کہ سوچنے، سمجھنے، برتنے اور جاننے پر کھنے کے پیمانے بدل جائیں۔ اب غربت وامارت کو ناپنے کا پیمانہ مقامی تہذیب یا اس کا مذہب اور اس کے زمین وآسمان سے نہیں مغرب سے آتا ہے۔ پیمانہ بدل جائے تو جو شے کل تک سیدھی تھی آج الٹی نظر آتی ہے۔ مقامی لوگ کل تک اپنے پیمانے کے مطابق امیر تھے جیسے ہی جدید تعلیم اور میڈیا کے ذریعے انہوں نے مغرب کا پیمانہ لیا وہ فوراً غریب ہو گئے اور اب ترقی کے ذریعے اپنی غربت دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں حالانکہ اسی ترقی کے پیمانے نے ان کو فی الحقیقت غریب کر دیا ہے اب وہ ہمیشہ غریب ہی رہیں گے۔

تھری کپ آف ٹی (Three Cups of Tea) کے جاہل غبی مصنف کو دنیا کی اٹھارہ یونیورسٹیوں سے تعلیم میں پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری اس لیے دی گئی کہ اس نے پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے ان مذہبی روایتی علاقوں میں سیکولر تعلیم کے اسکول کھول دیے جہاں ان کی اجازت نہ تھی اور جہاں کی تہذیب، معاشرت، معیشت سے اس تعلیم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

اس شخص نے سب سے پہلے ایک شیعہ عالم دین کو اس کام پر آمادہ کیا۔ جیسے ہی شیعہ علاقے میں سیکولر عام تعلیم کے سکول کھلے سنّی علاقوں نے یہ سمجھا کہ وہ ہم سے آگے نکل جائیں گے لہٰذا ان کے علاقے میں بھی جدید سکول کھل گئے۔ جو کام امریکی فوج نہیں کر سکی وہ کام ایک جاہل آدمی نے کر ڈالا۔ اب ان علاقوں میں تعلیم حاصل کرنے والے تیزی سے شہر منتقل ہو رہے ہیں۔

جدید سیکولر تعلیم ان کی اقدار، روایات، رویے، طرز زندگی سب کچھ تہس نہس کر رہی ہے اور لوگوں کو ان کی جڑوں سے اکھاڑ کر شہروں کی طرف ہانک کر پچاس پچاس منزلہ ڈربوں، فلیٹوں، کھوکھوں، کابکوں میں رہنے پر راضی کر رہی ہے۔ اپنی جنت چھوڑ کر یہ شہروں کے جہنم میں جلنے پر خوش ہیں۔ بوڑھے اور عمر رسیدہ آخر میں وہاں رہ جائیں گے پھر ملٹی نیشنل کارپوریشنز یہ علاقے خرید لیں گی۔

تعلیم و تربیت تحریر: مریم سکینہ [1]، ترجمہ: مدیر

تعلیم کو استعمار کے پنجے سے نکالنے کی ضرورت

مَیں نے GCE/IGCSE کا نصاب پڑھا بھی ہے اور پڑھایا بھی ہے اور اس دوران میرا تاثر یہ رہا ہے کہ یہ نصاب اور اس میں پیش کردہ تصورات، اقدار اور رویے بلکہ اس کا طریق تشریح اور امتحان سب لارڈ میکالے کی اس اسکیم کی توسیع معلوم ہوتے ہیں جس کے پیش نظر یہ تھا کہ ایک ایسی نسل پیدا کی جائے جو اپنے نام اور رنگ کے لحاظ سے ہندوستانی لیکن اپنے ذوق، آراء، اخلاق اور فکر کے لحاظ سے انگریز ہو۔ اس نصاب کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب ارفع اور مقدس ہے مثلاً اس میں 'ورلڈ ہسٹری' کے مضمون کو دیکھیے تو اس کا اکثر مواد تاریخ یورپ و امریکہ سے متعلق ہے۔ غیر مغربی اقوام کا ذکر برائے نام ہے اور جو ہے وہ بھی استشراقی نقطۂ نظر پر مبنی ہے۔ اس میں جنگ عظیم اوّل کے اثرات ونتائج کا بھی ذکر ہے لیکن ان میں مشرق وسطیٰ کی تباہی اور مسلم ممالک کو ٹکڑوں میں بانٹ کر اور غلام بنا کر اتحادیوں میں تقسیم کرنے کا ذکر تک نہیں ہے۔

'سوشیالوجی' کا مضمون معاشرے کا مطالعہ یورپ کی تحریک تنویر سے شروع کرتا ہے اور ابن خلدون کے 'مقدمہ' کی طرف اشارہ بھی نہیں کرتا۔ اس میں سارے ساجی نظریات کا مطالعہ مغربی فلسفے کے تناظر میں کیا گیا ہے۔ جب کوئی مثال دینی ہو تو طلبہ سے جاتا ہے کہ وہ برطانوی معاشرے سے مثال لائیں کیونکہ اسی کے بارے میں نصاب میں تفصیلات دی گئی ہیں جبکہ طلبہ کے مقامی ماحول اور معاشرے کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مجھے بحیثیت استاد کوفت ہوتی ہے جب طلبہ کو ان کی معاشرت کے بارے میں پڑھانے کی بجائے برطانوی معاشرت کے بارے میں پڑھاؤں۔

''پاکستان سٹڈیز'' کے نصاب میں تحریک پاکستان کی تاریخ کے حوالے سے مجھے کبھی یہ پڑھنے پڑھانے کا موقع نہیں ملا کہ انگریزوں کی استحصالی معاشی پالیسیوں کی وجہ سے بنگال میں شدید قحط پڑا تھا۔ انہی پالیسیوں کی وجہ سے بنگال کی کاٹن انڈسٹری تباہ ہو گئی تھی اور لارڈ میکالے

---

[1] دانشور، استاد، مصنفہ

کے استعماری تعلیمی منصوبے کی وجہ سے مدارس بند ہوگئے تھے۔ یوں مجھے اپنے موجودہ حالات کو کبھی ان کے صحیح تناظر میں سمجھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ لہٰذا ناگزیر ہے کہ ہمارے ماہرین تعلیم اس نصاب پر نظر ثانی کریں اور تعلیم کو استعماریت کے شکنجے سے نکالنے کے پراجیکٹ کا آغاز کریں۔

موجودہ نظام تعلیم بڑی عیاری سے اردو اور مقامی زبانوں کا حق مار کر انگریزی کو ان پر مسلط کیے ہوئے ہے اور یوں استعمار کی زبان انگریزی نصاب پڑھنے والوں کے لیے فرسٹ لینگوئج بن جاتی ہے اور ان کے تصورات، اقدار اور رویے اس سے متاثر ہوتے ہیں کیونکہ زبان ہمیشہ اپنے بولنے والوں کی تہذیب وثقافت اور نظریات کے ابلاغ کا آلہ اور ذریعہ ہوتی ہے اور چھوٹی عمر کے بچے اسے اپنا سمجھ کر اس کے تصورات ونظریات کو بلا تنقید قبول کرتے چلے جاتے ہیں۔

اس سے موجودہ نسل اپنی نظری بنیاد سے محروم ہوچکی ہے اور اس کا تباہ کن نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ اپنی شناخت اور ورثے سے محرومی کے بحران میں مبتلا ہوچکی ہے اور اردو زبان میں اسلامی روایت کا جو وسیع ذخیرہ موجود ہے وہ اس سے استفادہ کرنے سے بھی محروم رہ گئی ہے۔ اگر موجودہ حالات برقرار رہے تو بہت جلد اردو اور دوسری مقامی زبانوں کا وسیع نظری اور تراثی ذخیرہ ہماری نئی نسل کے لیے غیر مانوس اور اجنبی بن کر رہ جائے گا۔

طلبہ کی کئی نسلیں اس مغرب زدہ نصاب ونظام تعلیم سے گزر چکی ہیں اور گزر رہی ہیں اور اس کے نتائج یقیناً ہولناک نکلیں گے۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ علم وتعلیم کو اس استعماری شکنجے سے نکالا جائے، ذریعۂ تعلیم اردو اور مقامی زبانیں ہوں اور نصابی مواد مقامی تناظر میں تیار کیا گیا ہو۔ پرائمری سطح پر خصوصاً یہ بہت اہم ہے کیونکہ اس عمر میں بچے کا ذہن خالی سلیٹ کی طرح ہوتا ہے کہ اساتذہ جو بھی اس پر لکھ دیں بچہ اسے قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ اس عمر میں کسی بچے کو کسی غیر ملکی زبان کو اپنی فرسٹ لینگوئج کی طرح پڑھانا اور سکھانا اس کی شخصیت اور اس کی ابلاغی مہارتوں کو بُری طرح زک پہنچاتا ہے۔

اگر تعلیم کو استعماری شکنجے سے نکالنے کے لیے جلد سنجیدہ کوششوں کا آغاز نہ کیا گیا تو ہم اپنے پیارے اور ذہین بچوں کو بدیسی تہذیب وثقافت اور نظریات کا شکار ہونے سے ہرگز نہ بچا سکیں گے۔

Courtesy: http://maryamsakeenah.blogspot.com/2021/05/decolonizing-education.html

تعلیم و تربیت　　مدیر

مدرسہ ڈسکورسز

متجددین کی سرگرمی اور دینی مدارس کی سستی و بے حسی

امریکہ میں بیٹھے یہود و نصاریٰ نے اپنی ایک مشنری یونیورسٹی کو فنڈز مہیا کیے جس نے پاک و ہند کے کچھ متجددین کو ہائر کیا جنہوں نے یہاں کے دینی مدارس کے طلبہ کو جدید علوم کا تعارفی مطالعہ کرایا، انگریزی زبان سکھائی اور انہیں اسلامی علوم کا متجددانہ نقطہ نظر سے مطالعہ کرایا اور کئی بیچز فارغ ہوئے۔

اس کا حاصل کیا ہے؟ دینی مدارس کے کچھ فارغ التحصیل طلبہ کو جدید دنیا کی ہوا لگی۔ مغربی فکر و تہذیب کی برتری کے جراثیم ان کے دماغوں تک پہنچے۔ جدیدیت اور فکری آزادی کے نام پر اور جمود و تقلید اور قدامت پرستی کی مذمت کرتے ہوئے متجدد اساتذہ نے تجدد کے صحیح ہونے کے تاثرات مسلسل طلبہ کے اذہان و قلوب میں ڈالے جن سے ان کا متاثر ہونا منطقی اور فطری ہے۔ یہ طلبہ، ظاہر ہے، اپنے خیالات کو مستقبل میں دینی حلقوں میں اور مدارس و مساجد میں پھیلائیں گے، فتنہ و فساد کا سبب بنیں گے اور کچھ لوگوں کو متاثر بھی کریں گے۔

جب سے مدرسہ ڈسکورسز کا آغاز ہوا، ہم نے ان متجددین کا تعاقب کیا۔ مدرسہ ڈسکورسز کے نام سے ہماری مطبوعہ کتاب موجود ہے (اسے پڑھنے کا ذوق رکھنے والے ہم سے طلب فرما سکتے ہیں) ہم نے دینی مدارس چلانے والے علماء کرام کو مسلسل توجہ دلانے کی کوشش کی کہ وہ اس صورتِ حال کا نوٹس لیں لیکن ہماری آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ ہم پچھلی کئی دہائیوں سے دینی مدارس کو مزید مؤثر اور مفید بنانے کے لیے جو گزارشات ان کی خدمت میں پیش کرتے آرہے ہیں (البرہان کے مضامین اور ہماری تین کتابیں اس پر گواہ ہیں) انہیں بھی کم ہی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ اپنی ہٹ کا پکا ہونا اچھی بات ہے لیکن بدلے ہوئے حالات پر غور نہ کرنا اور اپنے خیر خواہوں اور ہمدردوں کی بات پر بھی کان نہ دھرنا کیا خوبی کی بات ہے؟

ہم دینی مدارس کے کارپردازان سے پھر کہتے ہیں کہ وہ وقت کے چیلنج کا ادراک کریں۔ اپنے نصاب و نظام پر نظرِ ثانی کریں اور مغربی فکر و تہذیب سے عدم اعتناء کا رویہ ختم کریں۔ اگر انہوں نے یہ نہ کیا تو مخالفین نے اس صورت حال سے پہلے بھی فائدہ اٹھایا ہے، آئندہ بھی اٹھائیں گے۔

تزکیۂ نفس

رعایت اللہ فاروقی

آؤ! اللہ سے دوستی کرلیں

اور پھر اس کے کرشمے دیکھیں

میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے صرف عبادت اور دعاء کا رشتہ رکھنے سے بات نہیں بنتی یعنی اس سے دوستی کا حقیقی لطف نصیب نہیں ہوتا۔ اس بات میں کوئی شک ہی نہیں کہ اس کی عبادت ہی ہماری تخلیق کا اصل مقصد ہے اور اس سے نہیں مانگیں گے تو کس سے مانگیں گے؟ لیکن مَیں بات عبادت کی ذمہ داری نبھانے اور صرف مشکل یا ضرورت کے لمحوں میں اس سے رجوع کرنے سے ذرا آگے بڑھ کر ذاتی سطح کے تعلقات کی کر رہا ہوں۔ وہ ذاتی تعلقات جو رفتہ رفتہ بے تکلف بھی ہو جاتے ہیں اور اس کی جانب سے جوابات عملاً آپ کو اپنی زندگی میں نظر آنے لگتے ہیں۔ یوں صورتِ حال رفتہ رفتہ یہ ہو جاتی ہے کہ بعض چیزوں کی آپ کو محض خواہش ہی پیدا ہوئی ہوتی ہے کہ وہ پوری ہو جاتی ہے یعنی وہ مانگنے کی نوبت بھی نہیں آنے دیتا۔ اس ذاتی دوستی کی شرط بس ایک ہی ہے۔ یہ بے لوث ہونی چاہیے۔ اسے دوست اس نیت سے نہیں بنانا چاہیے کہ دنیا کے خزانے ملنے لگیں گے۔ اس طرح سوچیں گے تو بات نہیں بنے گی۔ اس سے دوستی بس اس کے حصول کے لیے ہونی چاہیے۔ اس حوالے سے ذاتی تجربہ محض اس لیے شیئر کر رہا ہوں کہ آپ بھی اگر چاہیں تو ایسا کر سکیں اور دنیا سے بے نیاز ہی نہیں بلکہ بے خوف بھی ہو سکیں۔ پھر چاہے وہ ٹینکوں والے ہوں، خواہ خداوندان اکابر۔

نہایت ہی سادہ طریقہ ہے۔ کسی سے سیکھا نہیں تھا، بس مشکلات کے ایک دور میں سب نے ساتھ چھوڑ دیا تھا تو دوستی کے لیے اس کے سوا کوئی بچا ہی نہ تھا۔ سو اسے دوست بنا کر تنہائی دور کی تھی۔ آغاز یوں ہوا تھا کہ ایک شام دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا اور اسے مخاطب کر کے کہا "میرے ربّ! میں آپ کو ایک قصہ سنانا چاہتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں بلکہ اس لیے کہ اپنا دکھڑا کسی کو سنانا چاہتا ہوں مگر سننے کے لیے آپ کے سوا کوئی بچا ہی نہیں....."

اور یوں میں نے اسے ایک ذاتی قصہ سنانا شروع کیا۔ اور قصداً اسے طویل سے طویل تر کرتا چلا گیا۔ اس کی جزئیات یوں بتاتا گیا جیسے کسی لاعلم کو بتائی جاتی ہیں۔ لطف بہت آیا، دل ایسا ہلکا ہوا جیسے روئی کا گالا۔ یوں یہ سلسلہ مستقل چل پڑا مگر یوں کہ ہر بار دیوار سے ٹیک کے چکر میں نہ پڑتا بلکہ جہاں بھی جس حال میں بھی تنہائی میسر آئی اس سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ بسا اوقات اس سے بات کرتے ہوئے کسی بات پر بالکل اسی طرح ہنس بھی دیتا ہوں جس طرح دوستوں سے

بات کرتے ہوئے ہنسی والی بات پر ہنس دیتے ہیں۔شروع میں دل ہلکا ہونے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا۔مگر بہت جلد میں نے عقیدے کی دنیا سے باہر عمل کی دنیا میں اس کی ہلچل دیکھنی شروع کردی۔مثلاً بیٹے نے کہا کہ انجینئر بننا ہے اور میرے پاس ٹکا نہیں۔اس نے بھائی رحمت اللہ کے ذمہ لگا دیا اور اس نے بچے کو انجینئر نگ کرادی۔

ایک دن ٹیکسی میں جاتے ہوئے بچوں میں سے ایک نے پوچھا''اگر آپ گاڑی خریدنے کے لائق ہوتے تو کون سی خریدتے؟''میں نے کہا''ٹویوٹا کی انڈس''۔جیب میں ٹکا نہیں تھا اور مہینے بعد مَیں انڈس کار کا مالک بن گیا۔ہوا یوں کہ جاب جانے کے نتیجے میں مشکلات شروع ہوئیں تو جس زمانے میں کوئی کسی کو دس ہزار روپے ادھار نہیں دیتا تھا اسی زمانے میں ایک جگری یار میرے پیچھے پڑ گیا کہ''یہ میرے پاس دس لاکھ روپے پڑے ہیں جو نہ انڈے دے رہے ہیں اور نہ بچے، یہ تم لو اور انہیں کسی کاروبار میں لگا کر کچھ نہ کچھ خرچے کا انتظام کرلو''۔میں نے کہا''مجھے کاروبار نہیں آتے، یہ ضائع ہوجائیں گے''تو جواب ملا''ہونے دو ضائع''۔یوں میرے پاس ٹویوٹا انڈس آ گئی۔

۔ فیملی اسلام آباد سے کراچی شفٹ کرنے کا مرحلہ آیا تو جیب حسبِ معمول خالی۔کسی سے ذکر بھی نہیں کیا اور ایک پرانے دوست نے اپنی طرف سے کہہ دیا کہ''بھئی تمہارے سامان کی کراچی منتقلی کا بل میں ادا کروں گا۔''

۔ گھر پسند آیا اور مالک مکان نے ایڈوانس وغیرہ کے کھاتے میں ڈیڑھ لاکھ سے اوپر کا مطالبہ رکھ دیا تو بھائیوں نے کہا''اس کی ادائیگی تو ہم کریں گے۔''

۔ ایک بار پھر نوکری گئی تو بھائی سے کہا کہ''اس مالک مکان سے معاملات آپ نے ہی طے کیے تھے، اسے کہیے کہ جب تک نوکری نہیں لگ جاتی کرائے کا مطالبہ نہ کرے۔''بھائی نے کہا ''اچھا ٹھیک ہے، کہہ دیتا ہوں۔''اور کہنے کی بجائے اگلے ماہ سے کرایہ خود ادا کرنا شروع کردیا۔

۔ دو بچوں کی شادی ہوگئی اور الحمدللہ عزت اور وقار کے ساتھ ہوگئی وہ بھی اس حال میں کہ بغیر میرے مطالبے کے سارا خرچ بھائیوں اور ایک عزیزہ نے اٹھایا۔آمدنی میری اتنی ہے کہ گھر کی دال روٹی بھی چلنی مشکل نظر آئے مگر فروٹ، مچھلی، گوشت، چاول، شہد، زیتون اور پتا نہیں کیا کیا پیٹیوں کے حساب سے آتا ہے۔اور یہ سب مانگنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

۔ میں نے اپنے ربّ کو پنڈی میں''روشن دان والا''کا نام دے رکھا تھا۔جب مَیں اپنے

کمرے میں اس سے کوئی چھوٹا موٹا جملہ بھی کہتا تو کمرے کے روشن دان کے راستے آسمان کی سمت دیکھ کر مثلاً کچھ یوں کہہ دیتا ''روشن دان والے! تیرا جواب نہیں، تو عجیب ہی ہے۔'' کبھی کسی دوست نے اپنی کسی پریشانی کا ذکر کیا تو دل ہی دل میں خود سے کہا ''چلیں آج اس کے لیے بھی روشن دان والے سے بات کرتے ہیں۔''

- اب کراچی منتقل ہوئے ہیں تو یہاں میرے میٹرس سے متصل کھڑکی ہے۔ یوں اب میں نے اس کا نام بدل دیا ہے۔ اب وہ ''کھڑکی والا'' ہے جب بھی کوئی ایسی تحریر قلم سے نکل آئے جو مجھے بھی چونکا دے تو فوراً بیٹھے بیٹھے کھڑکی کے راستے آسمان کی سمت دیکھتا ہوں، چاہے کھڑکی پر پردہ ہی کیوں نہ پڑا ہو، اور کہتا ہوں ''کھڑکی والے! کہاں مجھ جیسا پٹھان جس کا اردو کی ٹانگیں توڑنا ضرب المثل بن چکا اور کہاں یہ تحریر اور وہ بھی ایسے پٹھان کے قلم سے جس نے اردو بطور نصاب کبھی ایک دن کے لیے بھی نہیں پڑھی۔ یہ تُو ہی ہے جو کیے جا رہا ہے۔''

- ''کوئی کمنٹس میں کسی تحریر پر اچھی سی داد دے دے تو تب بھی لازماً کھڑکی میں دیکھ کر کہتا ہوں ''کھڑکی والے! اس بیچارے کو کیا پتہ کہ یہ تو میرا کام نہیں تیرا کرم ہے۔''

ہاں! اگر اس پوسٹ سے آپ یہ نتیجہ اخذ کر بیٹھے کہ میں کوئی ولی اللہ ہوں، مجھ سے تو دعائیں لینی چاہئیں تو میرے ربّ کی قسم! آپ شیطان کے فریب میں آ گئے۔ اور اگر آپ نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ اتنے فضول آدمی کے ساتھ بھی اگر اس کا معاملہ اور سلوک یہ ہے تو کیوں نہ میں بھی ایسا ہی کروں؟ تو سمجھ لیجیے کہ قدرت آپ پر مہربان ہے۔ وہ آپ کی بھی منتظر ہے۔ آپ کتنے ہی گنہگار کیوں نہ ہوں، آپ کتنے ہی خطا کار کیوں نہ ہوں، یہ چلن اختیار کر سکتے ہیں۔ دیکھیے! وہ دوست بن کر رہے گا اور اپنی دوستی کے ایسے ایسے مظاہر دکھائے گا کہ آپ کو مبہوت کر دے گا۔

کچھ مولویوں نے اُسے کسی منتقم مزاج مہتمم جیسا سمجھ رکھا ہے جس سے وہ آپ کو ہر وقت ڈراتے رہتے ہیں اور آپ سے کہتے ہیں کہ اس کی رضاء اس لیے اختیار کرو کہ ایسا نہ کرنے کے نتیجے میں وہ تمہاری اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ میرے اور آپ کے لیے وہ اینٹ سے اینٹ بجانے والا نہیں، سینے سے سینہ ملانے والا ربّ ہے۔ اس کی اینٹ بجانے والی صفت سے وہ ڈرے جو اس سے سرکش ہو اور اس کا باغی ہو، ہم اپنے دوست سے کیوں ڈریں؟ اور دوست بھی وہ کہ اس جیسی دوستی سات ارب انسان مل کر بھی نہیں نبھا سکتے۔ ہاں! میں اس سے ڈرتا بھی ہوں مگر تب جب کچھ غلط کرنے لگتا ہوں (بشکریہ'الداعی')۔

تفہیم مغرب

ڈاکٹر محمد امین

مغربی تہذیب دینِ کفر اور دینِ غیر اللہ ہے (دوسری قسط)

مسلمانوں پر اس کا ردّ واجب اور اس کی پیروی حرام ہے

[اگر چہ راقم ایک سعودی یونیورسٹی سے فقہ واصول فقہ میں ایم فل کی ڈگری رکھتا ہے لیکن نہ تو اس نے کبھی فتویٰ دیا ہے اور نہ کبھی فتویٰ کی زبان استعمال کی ہے بلکہ ہمیشہ دلیل سے اپنا مؤقف پیش کیا ہے لیکن ہمارے علماء کرام اور مغربی تہذیب یافتہ لوگوں کی اکثریت کو کیونکہ مغربی تہذیب کے تنقیدی مطالعے کا موقع نہیں ملا اس لیے ان کا مؤقف اس کے بارے میں بہت نرم ہے۔ ہمارے اس عنوان کو اختیار کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان کو تنبیہ ہو اور وہ اس معاملے کی اہمیت اور نزاکت کو سمجھیں اور اس پر غور کریں۔ مدیر]

جب ہم کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب دین کفر ہے، دین غیر اللہ ہے تو اس کے دو بنیادی سبب ہیں: ایک یہ کہ مغربی تہذیب کے وہ اساسی افکار جن کی وہ پیداوار ہے، وہ کفر والحاد پر مبنی ہیں اور دوسرے یہ کہ قرآن حکیم نے بھی انہیں کافر وملحد کہا ہے۔ اب اس کی کچھ تفصیلات ملاحظہ فرمائیں:

مغربی تہذیب کے اساسی افکار کفر والحاد پر مبنی ہیں

یہاں ہم پہلے ان بنیادی افکار کا ذکر کریں گے جن پر مغربی تہذیب کھڑی ہے اور پھر ان کی تقییم کرتے ہوئے اور اسلامی تعلیمات سے ان کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے یہ ثابت کریں گے کہ یہ افکار قرآن وسنت سے متضاد اور ان کے خلاف ہیں:

مغربی تہذیب کے اساسی افکار

مغربی تہذیب کے تشکیلی اور اساسی افکار میں اگرچہ بہت سے نظریات اور ازموں (Isms) کا ذکر کیا جا سکتا ہے لیکن ہم ان میں سے چند اہم کا ذکر کریں گے جیسے ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، میٹریلزم، کیپٹل ازم اور ایمپریسزم (Empiricism)۔ پھر ان افکار کے نتیجے میں بننے والے ورلڈ ویو اور فلسفۂ علم کا ذکر کریں گے اور پھر اسلامی تعلیمات سے ان کا موازنہ کرتے ہوئے انہیں اسلام مخالف ثابت کریں گے، ان شاء اللہ۔

ہیومنزم(Humanism)

سادہ الفاظ میں ہیومنزم کا مطلب ہے وہ نظریہ جس میں انسان اوراس کی آزادی، اقداراور خواہشات کومرکزی حیثیت دی گئی ہو۔ چنانچہ اس نظریے کے آثارہمیں یونانی فلسفے سے منتقل ہوتے نظرآتے ہیں۔ چودہویں صدی میں اس لفظ کا استعمال اطالوی ہیومنسٹ Petrach نے کیا جس نے علوم انسانی (Humanities) کے حوالے سے قدیم لاطینی دانش کے احیاء کی کوششیں کیں۔لیکن تحریک نشأۃ ثانیہ اورمغرب میں سائنسی طرزفکر کے غلبے کے بعد انیسویں اور بیسوی صدی میں اس نظریے میں ہمیں سیکولرزم اوردین دشمنی کے رجحانات غالب نظرآتے ہیں (گوبعض ایسے ہیومنسٹ بھی ہیں جو مذہب کی تردیدنہیں کرتے)۔ رواں صدی میں ہیومنزم کا اظہار کئی صورتوں میں ہوا ہے۔ موجودیت (Existentialism) اور مظہریت (Phenomenology) بھی اسی کا پرتو ہیں۔سائنٹفک ہیومنزم کے علمبردار مذہب کودیس نکالا دے کوسائنسی علوم کے ذریعے فرد کی آزادی اوراس کی بہتری کے لیے کام کرنے کے دعوے دار ہیں۔(عیسائی) مذہب میں یقین رکھنے والے جن دانشوروں نے ہیومنزم کا علم سنبھالا (جیسے ارونگ بابط[Irving Babbitt]اور جیکوز ماریتان[Jacques Maritain]انہوں نے خدا، چرچ،عبادت اور دعاء جیسی مذہبی اصطلاحات کوان کے روایتی مفاہیم سے الگ کر کے انہیں نئے معانی پہنانے کی کوشش کی۔[1] کیرک گرڈ، کارل جاسپرز اور جبریل مارسل نے بھی ہیومزم اورعیسائی مذہب کے درمیان تلفیق کی ناکام کوشش کی تاہم مارٹن ہائیڈیگراورژاں پال سارتر نے کھلم کھلا ہیومزم کوالحادی رنگ دے دیا۔ ہائیڈیگر کے نزدیک انسان ایک شے نہیں بلکہ ایساوجود ہے جوصاحب اختیار ہے اورقوت فیصلہ رکھتا ہے۔ وہ انسان کوصداقت کا موجد بھی سمجھتا ہے اور انسان کے مقابلے میں خدا کا بھی قائل نہیں ہے۔

سارتر نے اپنی تالیف (Existentialism as Humanisim) میں ہیومنزم کا موجودیاتی تصور پیش کیا ہے۔ وہ ہیومنزم کوانسان دوستی کی بجائے انسان پرستی تک پہنچادیتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے''میراعقیدہ یہ ہے کہ سوائے انسانی کائنات کے کوئی کائنات نہیں ہےاوریہی ہمارا ہیومنزم ہے جس سے ہم انسان کویاددلاتے ہیں کہ سوائے انسان کے کوئی اس کے یے قانون نہیں بناسکتا۔ ہم نے مذہب کوکھودیا ہے لیکن ہیومنزم کو پالیا ہے۔ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ

---

[1] Paul A.Kurz, Forbiddin Fruit: The Ethics of Humanism, P-108

انسان کو آزاد کرایا جائے اور اسے قادر مطلق سمجھا جائے۔ ہم نے خدا کے وجود کا انکار کر دیا ہے تا کہ وجودِ انسان وجودِ مطلق بن جائے۔"(۱)

سارتر کی مابعد الطبیعیات کا ایک اہم تصور یہ ہے کہ کائنات میں کسی قسم کا نظم و تناسب موجود نہیں ہے۔ اس میں جو توافق نظر آتا ہے وہ خود انسان کے ذہن کا دیا ہوا ہے۔ وہ اس بات کا بھی قائل نہیں ہے کہ کائنات عدم سے وجود میں آئی ہے وہ خدا کے وجود کا منکر ہے اور اپنے فلسفے کو ملحدانہ ہیومنزم کا نام دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کا وجود تسلیم کر لیا جائے تو انسان فاعل مختار نہیں رہتا۔ اس کے خیال میں یا تو انسان فاعل مختار ہے، خدا کا محتاج نہیں ہے اور یا وہ خدا کا محتاج ہے اور مجبور ہے۔ وہ پہلی شق کا قائل ہے۔ وہ خدا کا اس لیے بھی قائل نہیں ہے کہ وہ کسی ایسی ذی شعور ہستی کو تسلیم نہیں کر سکتا جو بیک وقت کائنات میں جاری و ساری بھی ہو اور اس سے ماوراء بھی ہو جیسا کہ اہل مذہب کا ادعاء ہے۔ وہ معروضی قدروں کا بھی منکر ہے اور کہتا ہے کہ انسان اپنی ضرورت اور مرضی سے اپنی اخلاقی قدریں خود تخلیق کرتا رہتا ہے۔ اس وجہ سے سارتر کے نظام فکر میں کسی قسم کی ازلی وابدی صداقتوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔(۲)

سارتر کے ان اقوال کو سامنے رکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ ہیومنزم صرف انسان دوستی اور انسان نوازی نہیں بلکہ یہ خدا کی خدائی کا انکار اور فرد کی کبریائی اور الوہیت کے اثبات کا نام ہے۔ یہ صرف وحی اور مذہب کی برتری کا انکار نہیں بلکہ خود اس کی جگہ لینے کا ادعاء بھی ہے۔

اسی طرح ولیم جیمز بھی کسی صداقت مطلقہ کا قائل نہیں ہے اور وجودِ مطلق یعنی خدا کو "مابعد الطبیعی عفریت" کا نام دیتا ہے(۳) جبکہ نطشے (Nietzsche) کہتا ہے کہ خدا مر چکا ہے۔(۴)

ہیومنزم وہ اساسی نظریہ ہے جو یورپ میں سولہویں صدی میں ابھر کر سامنے آیا اور جدید مغربی تہذیب کی بنیاد بنا اور دوسرے سارے نظریات (سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم....

(۱) Jean Paul Sartre, Existentialism as Humanism, P-284

(۲) Jean Paul Sartre, Being and Nothingness, P-122

(۳) L. Zusne, Names in the History of Psychology, P-98

(۴) Fredeick Nietzsche, *The Gay Science*, trans. & ed. Walter Kaufmann, (New York: Vintage, 1974) part lll, sec. 125 (the Mad Man), 181.

وغیرہ)اسی سے پھوٹتے ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہیومنزم کا منبع یونانی فکر وفلسفہ ہے جو اگر چہ انسانی عقل ودانش کا بہترین نمونہ ہے لیکن وحی کی روشنی سے محروم ہونے کی وجہ سے مذہبی حوالے سے منبع کفر وضلالت اور انسانی حوالے سے غیر فطری ہونے کی وجہ سے انسانی مسائل کا صحیح حل پیش نہیں کرسکتا۔ ہیومنزم کی ایک بنیادی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ دین دشمن ہے اور اس وقت کی پاپائیت کو رڈ کر کے اس نے آگے بڑھنے کی راہ ہموار کی۔ ہیومنزم کی ابتدائی فکر اگر چہ یہ تھی کہ انسان کو کائنات میں مرکزی حیثیت حاصل ہے لیکن اس کے بنیادی تصور میں سوچ کی یہ خرابی موجود تھی کہ انسان عاقل ہے، اسے اپنے فیصلے خود کرنے چاہئیں اور وہ کسی غیر مرئی بالادست ذات (یعنی اللہ) کی ہدایت کا محتاج نہیں ہے یہ سوچ بتدریج تناور درخت بن کر سامنے آئی اور اس کا آخری نتیجہ وہ تھا جو نطشے، ہائیڈیگر اور سارتر کے الفاظ میں سامنے آیا کہ خدا مر چکا ہے اور انسان آزاد وخود مختار ہی نہیں مختار مطلق ہے۔ وہ اپنا خدا خود ہے اور اسے کسی اور خدا کی ضرورت نہیں۔

ظاہر ہے ہیومنزم کے یہ سارے افکار کفر والحاد ہیں بلکہ ہیومنزم آسمانی مذہب اور دین کے مقابلے میں خود ایک دین، اور نظامِ حیات بلکہ آسمانی خدا کے مقابلے میں ایک خدا بن کر سامنے آیا ہے۔

اس کے مقابلے میں اسلام ایک دین ہے جس کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ ایک اللہ انسان کا خالق و مالک ورب ہے، وہ اکیلا ہادی، معبود اور مطاع ہے۔ انسان اللہ کی حقیر مخلوق اور عبد ہے اور اس کا کام بلا چوں وچرا، بلا شرط وحدود، اللہ کی عبادت واطاعت کرنا ہے۔ اللہ کی عبادت واطاعت کا یہ رویہ لغوی اور اصطلاحی لحاظ سے 'اسلام' ہے اور جو اس اسلام کو اپنا لے وہ 'مسلم' کہلاتا ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ کی اس حیثیت اور اپنی عبد ہونے کی حیثیت کو نہ مانے وہ گویا اس کی الوہیت کا انکار کرنے والا یعنی کافر ہے۔ کافر عربی لفظ ہے جس کا معنی ہے انکار کرنے والا یعنی کافر اور ملحد وہ شخص ہے جو اللہ کی الوہیت اور اس کی ہدایت کے پیکج یعنی دین اسلام کا انکار کرے۔

اس وضاحت سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ ہیومنزم کفر والحاد ہے۔ یہ خدا کا انکار اور اس کے مقابلے میں انسان کی خدائی کا اثبات ہے۔ اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ ہیومنزم اسلام سے متضاد ہے اور ہیومنزم کو ماننے والا کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا۔

سیکولرزم (Secularism)

سیکولرزم کے مفاہیم انسان کی فکری تاریخ خصوصاً یونانی مفکرین کی تعلیمات کا حصہ رہے

ہیں تاہم کہا جا سکتا ہے کہ اس نام کے بغیر اس کی ابتداء سولہویں صدی کے انگلستان میں اس وقت ہوئی جب وہاں سیاسی اقتدار مذہبی حلقوں سے سیاسی حلقوں کو منتقل ہوا اور فیصلے مذہبی عدالتوں کی بجائے سول عدالتوں میں ہونے لگے۔ تاہم اس تحریک کی ابتداء اس نام سے انیسویں صدی کے وسط میں انگلستان میں ہوئی۔ اس کا بانی جارج جیکب ہولیوک (Holyoake) تھا جو ۱۸۱۷ء میں برمنگھم میں پیدا ہوا۔ ۱۸۴۱ء میں جب اس کا یقین خدا پر سے اٹھ چکا تھا، اسے مذہبی تعلیمات کی توہین کے الزام میں جیل بھیج دیا گیا۔ وہ چونکہ اسے ناانصافی گردانتا تھا اس لیے اس وقت کے مذہبی، سیاسی اور اخلاقی نظام کے خلاف اس کے دل میں کدورت پیدا ہوگئی۔ اس کے ساتھیوں میں سے چارلس ساؤتھ ویل، براڈلے، چارلس واٹ وغیرہ معروف ملحد تھے لیکن ہولیوک سیکولرزم اور الحاد کو مترادف نہ گردانے پر اصرار کرتا تھا۔ (۱) تاکہ مذہب کے ماننے والوں میں سے آزاد خیال لوگ اس کی تحریک شامل ہو سکیں۔

سیکولرزم کا فلسفہ یہ ہے کہ موجودہ دنیوی زندگی اور اس کی بہتری اور خوش حالی ہی ہمارا مطمح نظر ہونا چاہیے۔ آخرت کی زندگی سے ہمیں کوئی سروکار نہیں کیونکہ وہ ہمارے تجربے میں نہیں آئی۔ خدا اور مذہب اگر موجودہ زندگی کی خوشی اور خوش حالی پر منفی طور پر اثر انداز نہیں ہوتے تو ہمیں ان سے بھی کوئی سروکار نہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ انسان کو ہر طرح کی مکمل آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اس دنیا کی زندگی کے مسائل حل کر سکے اور اپنی مرضی اور خوشی سے جیسے چاہے جی سکے۔ (۲) دوسرے لفظوں میں یہ کہ مذہب کو موجودہ دنیوی زندگی اور اس کے مختلف شعبوں (سیاست، معیشت، معاشرت، قانون، تعلیم وغیرہ) میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے اور نہ اجتماعی زندگی کے ان شعبوں میں مذہبی تعلیمات کا کوئی کردار ہونا چاہیے۔ اپنی انفرادی زندگی میں اگر کوئی فرد اللہ یا آخرت کو مانتا ہے تو اس پر ہمیں اعتراض نہیں۔ (۳)

---

(۱) G.J.Holyoake, Sixty Years of an Agitatator's Life. vol.2,P-111

(۲) محمد عطاء اللہ صدیقی، سیکولرزم کا سرطان در ماہنامہ محدث، لاہور شمارہ جولائی، اگست، ستمبر ۲۰۰۰ء، ص: ۴۴، ۵۳، ۶۶ و مابعد

(۳) R.Flint. Anti-Theistic Theories, P-211ff

ظاہر ہے کہ یہ نقطۂ نظر مذہب کی نفی کرتا ہے کیونکہ ہر مذہب اللہ اور آخرت کے تصور پر موجودہ زندگی کی تنظیم کرتا ہے۔اس طرح سیکولرزم نے بالواسطہ طور پر نہ صرف روایتی مذہب کی نفی کی ہے بلکہ خود عملاً اس کی جگہ لے لی ہے۔(۱) اس نے مذہب کے دائرہ کار کو محدود کرنے اور اسے غیر مؤثر بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

سیکولرزم کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ کا اقتدار مطلق اور لامحدود نہیں ہے۔مغرب کا انسان دنیا کی زندگی اللہ کی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ اپنی مرضی سے گزارنا چاہتا ہے گویا دنیا کی زندگی میں وہ خود اپنا اللہ ہے۔ظاہر ہے کہ یہ رویہ نہ صرف اللہ اور وحی کی برتری کی نفی اور مذہب سے انکار کے مترادف ہے بلکہ یہ انسان کی اپنی خدائی والوہیت کا اعلان بھی ہے۔(۲)

یورپ میں جب ہیومنزم کا نظریہ ابھرا تو اس سے یورپی معاشرے میں ارتعاش پیدا ہوا کیونکہ عیسائیت جیسی کیسی بھی تھی، بہر حال صدیوں سے اُن کے معاشرے میں مروج تھی اور اُس کی جڑیں انسانی نفسیات میں گہری تھیں لہٰذا مذہب سے متاثر حلقوں نے ہیومنزم کی مخالفت شروع کر دی۔ہیومنزم کے حامی مفکرین نے اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کا یہ حل نکالا کہ سیکولرزم کا نظریہ پیش کر دیا۔اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم کسی شخص کو عیسائی ہونے اور رہنے سے اور انفرادی زندگی میں اسے مذہبی مراسم ادا کرنے سے نہیں روکتے لیکن معاشرے اور ریاست کی اجتماعی زندگی میں مذہب کا کوئی عمل دخل بہر حال نہیں ہونا چاہیے۔

سیکولرزم کا لفظ دینی، مذہبی، روحانی (انگریزی میں Religious, Spiritual Transcendental,Sacred) سے متضاد ہے۔مطلب یہ کہ فرد کی ذاتی زندگی اور مذہبی امور میں، یعنی وہ امور جو انسان اور خدا کے درمیان تعلق سے بحث کرتے ہیں، ان میں تو خدا اور مذہب کی پیروی کی جا سکتی ہے جیسے اللہ کی عبادت کرنا یا اس سے دعا مانگنا لیکن جو دینوی امور ہیں،

---

(۱) John Summerville. The Secularization of Early Modern England,P-8

(۲) Encyclopaedia of Religion and Ethics,s.v. Secularisim, vol.11,P-347

یعنی جن کا تعلق انسانوں کے مابین تعلقات سے ہے جیسے انسانوں کی اجتماعی زندگی یا معاشرے وریاست کے مسائل، تو ان میں خدا یا مذہب کی پیروی نہیں کی جائے گی۔

سیکولرزم کا خلافِ اسلام ہونا تین دلائل سے واضح ہے:

ایک یہ کہ سیکولر کے معنیٰ 'دنیاوی امور' کے ہیں، برعکس مذہبی، دینی اور روحانی امور کے؛ جب کہ اسلام میں دین و دنیا کی کوئی تفریق سرے سے موجود ہی نہیں کیونکہ اسلام نام ہے اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت کا جو ہمیں دنیوی زندگی اس کی رضا اور تعلیمات کے مطابق گزارنے کا علم دیتی ہے۔ لہٰذا دنیا کی زندگی کے سارے اعمال عین دینی کام ہیں بشرطیکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق کیے جائیں۔ لہٰذا اسلام میں کوئی عمل ان معنوں میں سیکولر ہوتا ہی نہیں کہ وہ حقیر، بُرا اور قابل مذمت ہو بلکہ اسلام کی رو سے دنیا کا ہر کام دینی کام ہے بشرطیکہ اللہ کی ہدایت کے مطابق کیا جائے۔

دوسرے سیکولرزم کے مغربی تصور کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اختیار انسان کا ہے کہ وہ جہاں چاہے خدا کی بات مانے اور جہاں چاہے نہ مانے۔ گویا زمین میں اصل بادشاہی، اختیار اور حاکمیت انسان کی ہے نہ کہ خدا کی۔ جبکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ وہ انسان کو عبد قرار دیتا ہے یعنی خدا کے مقابلے میں اس کی ہستی ہیچ اور کمترین ہے۔ اور ''اسلام'' کا لغوی اور اصطلاحی مطلب ہی اللہ تعالیٰ کی غیر مشروط اور غیر محدود عبادت اور اطاعت ہے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ "ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً"[البقرہ ۲:۲۰۸] اور اس چیز کی مذمت کرتا ہے کہ اللہ کے بعض احکام کو مانا اور بعض کو نہ مانا جائے۔ یہ رویہ اللہ کے نزدیک مردود اور نا قابل قبول ہے اور اسے اپنانے والا مستحق عذاب ہے[الصف ۶۱:۲، ۳ اور النساء ۴:۱۴۵] یہی وجہ ہے کہ اسلام میں دینی و دنیاوی امور کی کوئی تفریق نہیں۔

سیکولرزم کے کے مغربی تصور کے غیر اسلامی ہونے کی تیسری دلیل یہ ہے کہ اسلام میں اللہ کے کسی ایک حکم کا انکار ہدایت کے سارے پیکج کا انکار ہے جیسے ایک نبی کا انکار سارے انبیاء کے انکار کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان سارے انبیائے سابقہ پر ایمان لاتے اور انہیں پیغمبر مانتے ہیں۔ اسی وجہ سے مسلمان قادیانیوں کو مسلمان نہیں مانتے حالانکہ وہ خدا، رسول، قرآن اور دین کے دیگر سارے احکام کو مانتے ہیں سوائے ختم نبوت کے اور اسی وجہ سے حضرت

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زکوۃ نہ دینے والوں کے خلاف جہاد کیا تھا حالانکہ وہ خدا، رسول، آخرت اور قرآن سب کو مانتے تھے، نماز پڑھتے تھے اور حج کرتے تھے لیکن حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا جو ایک حکم الٰہی کا انکار کرتا ہے وہ گویا سارے احکام کا انکار کرتا ہے۔ اس لیے وہ مسلمان نہیں ہے۔

لبرل ازم (Liberalism)

لبرل ازم کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو لامحدود آزادی حاصل ہے۔ ہیومنزم اور سیکولرزم کا لازمی نتیجہ لبرل ازم ہے یعنی جب انسان یہ کہے کہ وہ کسی خدا کا عبد نہیں ہے بلکہ وہ خود مختار ہے اور جب وہ یہ کہے کہ اس کی مرضی ہے کہ جہاں جس بات میں چاہے وہاں اللہ کی مانے اور جہاں چاہے نہ مانے تو اس کا منطقی نتیجہ یہی نکلے گا کہ وہ آزاد ہے۔ جو چاہے سوچے اور جو چاہے کرے۔ اس رویے کا خلاف اسلام ہونا بالکل واضح ہے کیونکہ "اسلام" کا تو لغوی اور اصطلاحی معنی ہی یہ ہے کہ اپنی آزاد مرضی سے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے بلاشروط و بلا حدود کلی طور پر اس کے تابع کر دینا اور اللہ کی کبریائی کو تسلیم کرتے ہوئے خود کو اس کا عبد قرار دینا۔ اسلامی روایت اور اردو محاورے میں لبرلزم کا مطلب ہے مادر پدر آزادی یعنی انسان جو چاہے کرے اُسے کوئی پوچھنے والا نہیں اور وہ کسی کو جواب دہ نہیں۔ چنانچہ ایسی غیر محدود آزادی کی وجہ سے مغرب میں ہر مرد اور عورت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ باہمی رضامندی سے جب اور جس سے چاہیں جنسی لطف حاصل کریں۔ وہ بغیر نکاح کیے اکھٹے رہ سکتے ہیں، زندگی گزار سکتے ہیں اور بچے پیدا کر سکتے ہیں۔ عورت مرد کو طلاق دے سکتی ہے۔ عورت چاہے تو عورت کے ساتھ اور مرد چاہے تو مرد کے ساتھ اکٹھے رہ سکتا ہے اور نکاح کر سکتا ہے۔

فرد کی لامحدود آزادی کے اثرات مغرب میں زندگی کے ہر شعبے میں دیکھے جا سکتے ہیں مثلاً فرد آزاد ہے کہ وہ چاہے تو کسی مذہب یا دین کو مانے یا نہ مانے۔ اس کی مرضی ہے چاہے تو چرچ جائے نہ چاہے تو نہ جائے۔ چاہے تو لباس پہنے نہ چاہے تو نہ پہنے۔ مغرب میں ننگوں کے کلب عام بنے ہوئے ہیں جن کا ہر رکن، خواہ مرد ہو یا عورت، جب تک کلب میں رہے لباس نہیں پہنتا۔ بعض عورتیں اور مرد بغیر لباس کے سڑک پر آ جاتے ہیں۔ وہ بازاروں میں چلتے پھرتے ایک دوسرے کے گلے لگتے اور بوس و کنار کرتے ہیں اور کوئی کسی کو نہیں ٹوک سکتا۔ ہر مرد و عورت کو شراب پینے، جوا کھیلنے اور باہمی رضامندی سے زنا کرنے کی آزادی ہے۔

یہ آزادی فرد سے اجتماعیت کو منتقل ہوتی ہے اور جس طرح فرد اپنے ہر معاملے میں آزاد ہے اور کسی خدا، رسول، وحی کا پابند نہیں اسی طرح آزاد افراد کے منتخب نمائندوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے پارلیمنٹ بھی آزاد اور مکمل پاور فل ہوتی ہے اور وہ جو قانون چاہے بنا سکتی ہے۔ حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دے سکتی ہے۔ چنانچہ عملاً مغربی ممالک نے شراب، جوا، زنا، لواطت اور ہم جنس پرستی کو حلال قرار دے رکھا ہے۔

مغرب میں اس لامحدود آزادی (Unlimited Freedom) کو قانونی تحفظ حاصل ہے چنانچہ مغربی ممالک نے اقوام متحدہ میں بنیادی انسانی حقوق کا ایک چارٹر منظور کر رکھا ہے جس پر ساری دنیا کے ممالک نے دستخط کر رکھے ہیں (بشمول تمام مسلم ممالک کے) جس کی رو سے ہر فرد آزاد ہے کہ جو مذہب چاہے اختیار کرے اور جب چاہے بدل لے۔ جس مذہب کے فرد سے چاہے شادی کرلے وغیرہ وغیرہ۔ اور چونکہ مغربی فکر وتہذیب اس وقت دنیا پر غالب ہے اور اس تہذیب کو ماننے والے مغربی ممالک ہی دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور ہیں لہٰذا کسی ملک کی 'آزادی' کو اقوام متحدہ اور یہ مغربی ممالک اس وقت تک تسلیم ہی نہیں کرتے اور اسے آزاد ملک قرار ہی نہیں دیتے جب تک اس کے دستور وآئین میں یہ 'بنیادی حقوق' موجود نہ ہوں۔ چنانچہ اقوام متحدہ اور مغربی ممالک (اور ان کے دباؤ میں آکر دنیا کے تمام دوسرے ممالک نے بھی) افغان طالبان کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا تھا (سوائے پاکستان، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے) اس کے باوجود کہ سارے افغانستان پر ان کا قبضہ تھا اور وہ اچھے طریقے سے سارے ملک پر حکومت کر رہے تھے۔

ظاہر ہے لامحدود آزادی کا یہ تصور صریحاً غیر اسلامی ہے کیونکہ اسلام میں تو انسان اللہ کا عبد ہوتا ہے وہ آزاد ہوتا ہی نہیں اور قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے صاف فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کو پیدا ہی عبودیت (ایک اللہ کی پرستش واطاعت) کے لیے کیا ہے[۱]۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر انسان مکلف ہوتا ہے یعنی ذمہ دار اور جواب دہ (الّا یہ کہ وہ نابالغ بچہ ہو یا فاتر العقل مریض ہو یا سویا ہوا ہو)[۲]۔ 'اسلام' کا لفظی مطلب تسلیم ورضا اور اطاعت وفرمانبرداری ہے اور

---

[۱] الذاریات ۵۱:۵۶

[۲] سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۲۰۴۱

'مسلم' کہتے ہی اس فرد کو ہیں جو'اپنی آزاد مرضی سے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے تابع کردے، بلا حدود و بلا شروط' لہٰذا کوئی مسلمان 'مکمل آزاد' ہو ہی نہیں سکتا۔ اللہ کے نبی (ﷺ) نے مومن کی مثال ایک گھوڑے سے دی ہے جو کھونٹے کے ساتھ رسی سے بندھا ہو لہٰذا وہ اتنا ہی آزاد ہوتا ہے جتنی رسی لمبی ہوتی ہے، اس کے بعد اس کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے مغرب کی آزادی کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ' آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد کیونکہ مومن تو مادر پدر آزاد نہیں ہوتا، ہو ہی نہیں سکتا وہ تو بخوشی ان پابندیوں کو قبول کرتا ہے جو اللہ و رسول نے اس پر لگائی ہیں کیونکہ اسلام میں آخرت کا تصور ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کے بعد ایک اور عالم آنے والا ہے جس میں انسان کو دنیا میں اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے کہ اس نے دنیا کی زندگی اللہ کی مرضی کے مطابق گزاری یا نہیں؟ اسی وجہ سے اقبال نے کہا کہ ۔

محمد کی غلامی ہے سند آزاد ہونے کی
خدا کے دامن توحید میں آباد ہونے کی

خلاصہ یہ کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے کوئی مسلمان مغربی لبرل ازم کے معنوں میں لبرل ہو ہی نہیں سکتا اور نہ مسلم معاشرہ اور مسلم ریاست مغربی لبرل ازم کے معنوں میں لبرل ہو سکتی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مغربی لبرل ازم خلافِ اسلام ہے، یہ کفر کو مستلزم ہے بلکہ صریح کفر ہے اور کوئی مسلمان جب تک وہ مسلمان ہونے کا مدعی ہے، لبرل نہیں ہو سکتا۔

یہ بھی واضح رہے کہ 'ہم لبرل ازم' کے اپنے پاس سے کوئی معنی وضع نہیں کر سکتے کیونکہ لبرل ازم مغرب کی اصطلاح ہے اور اس کے معنی و مفہوم وہی بتائیں گے جن کی یہ اصطلاح ہے نہ کہ ہم اپنی مرضی سے اس کے معنی و مفہوم کا تعین کر لیں۔

میٹریلزم (Materialism)

مادہ پرستی کی اصطلاح اُردو میں بھی عام مستعمل ہے اور اس کا مفہوم مذہبی و اخلاقی تعلیمات (جو آخرت اور اعلیٰ انسانی اقدار پر زور دیتی ہیں) کے مقابلے میں یا ان کے علی الرغم دنیوی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھنا اور اسے ترجیح دینا ہوتا ہے۔ چنانچہ علمی اردو لغت میں مادہ پرست کے معنی لکھے ہیں ''مادے کو سب کچھ سمجھنے والا، دہریہ، خدا کا منکر''[1] مادہ پرستی کا نظریہ شروع ہی سے مذہبی نقطۂ

---

[1] وارث سرہندی، علمی اردو لغت، بذیل ''مادہ پرست''، ص: ۱۳۲۲

نظر کے برعکس اور بالمقابل سمجھا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ یونانیوں کے ہاں مادہ پرستی کے مفاہیم میں یہ عناصر شامل تھے:

۱۔ مادہ ازلی اور غیر فانی ہے۔

۲۔ عالم میں کوئی ذہن یا شعور کارفرما نہیں ہے یعنی اس پر کوئی یزدانی قوت متصرف نہیں ہے۔

۳۔ عالم میں کوئی مقصد اور غایت نہیں ہے۔

مغرب میں تحریک سأۃ ثانیہ کی ابتداء میں چونکہ پاپائیت نے فکری آزادی کی مخالفت کی لہٰذا سائنسدانوں کو مذہب کو رد کرنا پڑا اور مادہ پرستی کی طرف آنا پڑا۔ تھامس ہوبز (۱۶۷۹ء) نے مکمل مادیت کا ابلاغ کیا۔ اس کی رائے میں انسان سمیت کائنات کی ہر شے مادی ہے۔ وہ حسیات کے سوا کسی چیز کو علم کا ماخذ تسلیم نہیں کرتا، اس نے روح کے وجود سے انکار کیا اور مذہب کو غیر مرئی فرضی قوتوں کی دہشت قرار دیا۔ وہ قدر واختیار کا بھی منکر تھا۔ [1] تاہم جدید مادیت پسندی کا بانی ڈیکارٹ (۱۶۵۰ء) کو سمجھا جاتا ہے جو ذہن اور مادے کو مستقل بالذات مانتا ہے۔ اس کے نزدیک حیوانات کا جسم ایک خودکار مشین کی مانند ہے اور جسمانی لحاظ سے انسان بھی حیوان ہی کی طرح کی ایک مشین ہے۔

اٹھارویں صدی میں سائنس کی ہمہ گیر ترقی نے عقلیت پسندی کو جنم دیا۔ فرانسیسی مادہ پرست قاموسیوں (Encyclopaedians) نے وحی کے بغیر ہیومنزم کی بنیاد پر ایک مذہب مرتب کرنے کی کوشش کی۔ لامتری نے انسانی قلب و ذہن کے تمام اعمال کو میکانکی قرار دیتے ہوئے اسے دیگر حیوانوں کی طرح ایک حیوان قرار دیا۔ ہولباخ نے اس مادی نظریے کو ایک باقاعدہ مابعد الطبیعیات کی شکل دی۔ اس نے روح کے وجود سے انکار کیا اور مادے کو غیر فانی قرار دیا۔ اس نے کہا کہ فطرت چند اٹل قوانین کے تحت کام کر رہی ہے جن میں کوئی مقصدیت پنہاں نہیں۔ (جاری ہے)

---

[1] L. Zusne, Names in the History of Psychology, P-23

تفہیم مغرب مدیر

مسلمانوں کو کچلنے کے امریکی منصوبے

سابق امریکی جنرل ولزلے کلارک کے انکشافات واعترافات

امریکہ کے سابق فورسٹار جنرل ولزلے کلارک جو بش دورِ حکومت میں نیٹو کے سپریم الائیڈ کمانڈر بھی رہے، کے بیانات اور تقریریں یوٹیوب پر دستیاب ہیں۔خصوصاً دیکھیے:

America's Foreign Policy 'Coup'
General Clark on the Iraq Invasion

جنرل ولزلے کے بقول امریکی اعلیٰ قیادت نے اسے کہا تھا کہ نہ صرف عراق پر حملہ کرنا ہے بلکہ سات مسلم ممالک پر حملہ کر کے حکومتیں ختم کرنی ہیں۔ یہ سلسلہ عراق سے شروع ہو کر لیبیا، لبنان، شام، صومالیہ، سوڈان اور ایران تک جائے گا۔اس کے لیے پانچ سے دس سال کا ہدف رکھا گیا تا کہ اگلی سپر پاور کے سامنے آنے سے پہلے وہ یہ تباہی بلا روک ٹوک کر سکیں۔ یہ جنرل انکشاف کرتا ہے کہ ہم نے (امریکہ) عراق پر حملہ کرنے سے پہلے خود ہی عراق میں صدام مخالف فضا بھی پیدا کی تھی جب کہ ہمیں وہاں کوئی تباہ کن کیمیائی ہتھیار نہیں ملے جیسا کہ امریکہ پروپیگنڈا کر رہا تھا۔وہ کہتا ہے کہ ڈک چینی اور رمزفیلڈ وغیرہ ایسے حیران کن فیصلے کر رہے تھے جن سے لگتا تھا کہ امریکہ میں Policy Coup ہو چکا ہے اور جن سے میرا دماغ چکرا کر رہ گیا۔

افغانستان میں نہتے سویلین لوگوں پر بارود کی بارش برسائی گئی۔نہ صرف افغانستان بلکہ انڈیا کی مرضی اور مدد سے پاکستان کے اندر دہشت گرد کارروائیوں سے پچاس ہزار عام لوگ زندگی کی بازی ہار گئے۔

جنرل کلارک نے یہ حیران کن انکشاف بھی کیا ہے کہ سوشلزم کے خلاف مسلمان ممالک میں جو تحریکیں چلائی گئیں وہ بھی امریکی سپانسرڈ تھیں۔ہم کہتے ہیں کہ افغانستان میں ہمارے دینی عناصر نے روسی مداخلت کے خلاف جو تحریک مزاحمت چلائی اسے علی الاعلان امریکہ کی مالی، سیاسی اور فوجی مدد حاصل تھی لیکن کیا جن دینی قوتوں نے پاکستان میں ماضی میں سوشلزم کے خلاف تحریک چلائی کیا وہ بھی امریکی سپانسرڈ تھی؟ یہ بات تحقیق طلب ہے۔

تفہیم دین

صابر علی

قانون و اخلاق کا باہمی ربط

ایک پولیس کانسٹیبل ریاستی نظام کا ادنیٰ ترین رسمی کارندہ ہے۔ یہ کارندہ وردی میں ہو تو ریاستی قانون کا ڈنڈا ہی اس کی طاقت ہوتا ہے بلکہ یہ خود ہی قانون کہلاتا ہے۔ اس لیے قانونی لحاظ سے بڑے سے بڑا چوہدری، معزز اور شریف شخص بھی اس کے رحم وکرم پر ہوتا ہے۔ پولیس کے واسطہ پڑنے پر سب کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض ایک کانسٹیبل سے نہیں بلکہ ریاست کے سامنے ہے۔ ہمارا تمام تر رویہ اسی سنگین حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے خوف کے پہرے میں تشکیل پاتا ہے۔ قانونی جبر یعنی قانون کی تنفیذ ہمارے رویے کی اس حد تک تشکیل کرتی ہے کہ ہم ایک کانسٹیبل سے الجھنے کو مصائب کو دعوت دینا سمجھتے ہیں اور قانون شکنی کو گناہ اور کانسٹیبل سے بدسلوکی کو بداخلاقی پر محمول کرتے ہیں۔

دوسری طرف گاؤں کا نمبردار بھی ریاست کا بنیادی پتھر ہے لیکن وہ عوامی رنگ میں ہوتا ہے اور ایک اجتماعیت سے منسلک ہوتا ہے۔ چونکہ وہ غیر رسمی ہوتا ہے اس لیے اس کی اتھارٹی قانونی سے زیادہ اخلاقی وسماجی رنگ اختیار کرتی ہے۔ اس کی بات کو وزنی، فیصلے کو صائب اور رائے کو اہم سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال تنفیذی استعداد نہ ہونے کی وجہ سے اس کی کارکردگی جاسوسانہ نوعیت کی ہوتی ہے اور اسے اپنی عزت اور پوزیشن بنائے رکھنے کے لیے بڑی تگ ودو اور کئی سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔

پہلی مثال میں قانون نمایاں، ریاست مخفی اور معاشرت منفی ہے اس لیے تنفیذی قوت انتہا درجے کی اور اخلاقی قوت یکسر غائب نظر آتی ہے بلکہ اخلاقیات کا انہدام کرنے والی ایک نئی قسم کی اخلاقیات پیدا ہوتی ہے۔ دوسری مثال میں ریاست مخفی، معاشرت نمایاں اور قانون منفی لگتا ہے۔ سہولت کی خاطر قانون اور ریاست کو الگ الگ کہا گیا ہے۔ دونوں مثالوں میں ریاست کی خدمت، موجودگی اور کارفرمائی کا انداز مختلف ہے مگر انجام کار ریاست ہی کی خدمت ہو رہی ہے۔ اگر معاملات خراب ہو جائیں تو مسئلہ کو ذاتی بنا کر ہوا میں اڑا دیا جاتا ہے اور بدنامی اور ناکامی

کارندوں کے حصے میں آتی ہے۔ اصلاً کارندے کو قربان کردیا جاتا ہے کیونکہ اصولی طور پر ریاست کا کوئی بھی سٹیزن اپنی جان، مال اور ناموس کا مالک خود نہیں ہوتا بلکہ ان سب کی مالک ریاست ہوتی ہے۔

ان دونوں مثالوں میں سمجھانا یہ مقصود ہے کہ دوسروں کو متاثر، قائل، راغب، معمول اور محکوم یا مصروف کرنے سے متعلقہ تقریباً تمام سماجی اور فلاحی کاموں میں ایک بنیادی قسم کی غلطی ہورہی ہے۔ اجتماعی، معاشرتی یا فلاحی واصلاحی کاموں کی ہر سطح پر ہم اخلاق اور قانون کا آپسی تعلق اور ان کا تصور و مقام بدل چکے ہیں۔ اخلاق و قانون کا تصور ہمارے ہاں وہ نہیں رہا جو کبھی تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم فکری ارتداد کا شکار یا علم سے محروم ہوگئے ہیں۔ اخلاق و قانون کی علیحدگی میں شعبہ اصلاح کی اسپیشلائزیشن کا مسئلہ ہے جو پہلے نہیں تھا۔ مطلب یہ کہ پہلے اصلاحی ورفاہی کاموں کے لیے مخصوص تحریکیں یا الگ اداروں کا وجود نہ تھا اس لیے اخلاق و قانون کو اس نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ صرف اور صرف دعوتی واصلاحی ورفاہی کاموں کے لیے مخصوص اداروں اور تحریکوں کا بننا ایک بنیادی نوعیت کی تبدیلی کا اظہار ہے جس کے مضمرات بہت گہرے ہیں۔

تبدیلی یوں ہوئی کہ ہم نے اخلاق کو محض ذاتی پسند وناپسند کی چیز سمجھ کر قلبی کیفیت سے مخصوص کر کے اس کا تنفیذی و قانونی پہلو منہا کردیا۔ چونکہ قانون ایک نوع کی اخلاقیات کو جنم دیتا ہے اور دوسری نوع کی اخلاقیات کو ختم کرتا ہے اس لیے قانون میں اخلاقی حکم اور امکان لازمی موجود ہوتا ہے لیکن یہ اتنا مخفی اور مبہن ہوتا ہے کہ ہم بے دھڑک کہہ دیتے ہیں کہ قانون اور اخلاق کا آپس میں بیر ہے۔ یہ ایک غلط بات ہے۔ اس کا ثبوت یہی ہے کہ قانون کا مقصد فرد کی اخلاقی تشکیل اور اس کے کردار و عادات پر اثر انداز ہونا ہوتا ہے۔

اگر قانون کا نفاذ واطلاق ایک اخلاقی ذمہ داری ہے تو پھر اخلاق تنفیذی کیوں نہیں ہوسکتا؟ قانون پر عمل درآمد قانونی نہیں بلکہ اصلاً اخلاقی فریضہ مانا جاتا ہے اس طرح اخلاقی پابندی محض اخلاقی عمل نہیں بلکہ قانونی حیثیت اختیار کرجاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معروف ریاستی قانون اور روایتی اخلاقی اصول فی الحقیقت کسی مقتدرہ ذات سے ہونے والے فرامین کا صدور ہے۔

ریاست کا ہر حکم یا اس سے ظاہر ہونے والا ہر ارادہ عام زبان میں قانون کہلاتا ہے اور یہ ارادہ واظہار کبھی قانونی نہیں ہوتا یعنی مقتدرہ ریاست کے دیے ہوئے قانون کا اطلاق خود ریاست پر نہیں ہوتا اور نہ ہی تشکیل قانون کے اس عمل کو پیمانہ بناتے ہوئے قانون پر کوئی حکم لگایا جاتا ہے۔ کیونکہ ہر قانون غیر قانونی ہوتا ہے اس لیے اسی کو معیار بنائیں گے تو تنفیذ کے لیے جو چیز بچے گی وہ لاقانونیت ہی ہوگی۔ بعینہٖ اخلاق ہیں۔ ہر اخلاقی وصف اور اصول فی الحقیقت حکم ہے۔ اس حکم کو اخلاقی یا غیر اخلاقی کہنا بے کار بات ہے۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر اخلاقی حکم ان اخلاقی معیارات سے ماورا ہوتا ہے جو پہلے درجے میں حکم کی بنیاد ہوتے ہیں۔ اخلاقی وغیر اخلاقی کا وجود اس حکم کے بعد ہی قائم ہوگا پہلے نہیں۔ دوسری بات یہ کہ ہر حکم بحیثیت حکم ایک اخلاقی وعملی تنفیذی یا قانونی حکم ہی ہوتا ہے ورنہ حکم نہ رہے گا کیونکہ حکم عمل کے لیے ہے اور عمل بلا تنفیذ نہیں ہوتا۔ حکم کے ساتھ ہی اطلاق وتنفیذ کا جنم ہو جاتا ہے یعنی نفاذ بلا حکم ہو ہی نہیں سکتا۔ دوسرے لفظوں میں کسی بھی فعل کو بمطابق کسی حکم کے انجام لانا باعتبار قصد وغایت اخلاقی ہے اور باعتبار اجراء اور عمل پذیری تنفیذی وقانونی یعنی جبری ہے۔

اس بات کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ شریعت کے تمام احکام اخلاقی وقانونی ہیں یعنی وحی اپنے آغاز ہی سے دستوریت یا آئین وقانون بھی ہے کیونکہ یہ سب احکام تنفیذ یعنی عمل کے لیے ہیں اور جب ان کا نفاذ ہوگا تو پھر یہ طاقت اور جبر کا رنگ اختیار کریں گے۔ کسی حکم الٰہی کو اللہ کا حکم مان لینا ہی اخلاقی فعل ہے اور پھر اس حکم کی اطاعت کرنا اور کروانا ایک قانونی عمل ہے۔ اور یہ قانونی فعلیت دوسرے درجے میں بھی اخلاقی رہے گی جیسا کہ ریاستی قانون کی پابندی کو اخلاقی فریضہ کہا جاتا ہے۔ لہٰذا شریعت اسلامیہ میں اخلاق وقانون باہم اس طرح گندھے ہوئے اور پیوست ہیں کہ ان کا تجزیہ وتمیز عملاً گمراہ کن اور علماً ناجائز ہے۔

اب اگر یہ بات ثابت ہوگئی کہ اخلاق وقانون کی علیحدگی محال ہے تو اس کا جو نتیجہ فی الوقت مقصود ہے وہ یہ کہ انذار اور سزا تمام اخلاقی اعمال کے ساتھ انتہائی متعلقہ اور ناگزیر ہے۔ تنفیذ واطلاق جب جبر اور طاقت کا معاملہ ہیں تو اس بات سے مفر نہیں کہ تمام اعمال خواہ موسوم بہ اخلاق ہوں یا قانون، سزا اور سختی کے متقاضی ہیں۔ قانون کی پابندی کو اخلاقی فریضہ مان لینے کے بعد بھی

نفاذ کے لیے طاقت اور جبر کا استعمال کرنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھی جاتی اور خلاف ورزی یا انحراف مستوجب سزا ہوتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ امر اور بالفعل موجود حقیقت ہے جس کا مشاہدہ تجربہ سبھی کو ہے۔ بلکہ ایک طرح سے خالصتاً اخلاقی یا نجی یا انفرادی دائرے سے متعلق افعال واعمال بھی جبر کا پہلو لیے ہوئے ہیں لیکن اس کی نوعیت گروہی یا اجتماعی دباؤ سے متشکل ہوتی ہے اور انہیں جرم وگناہ کا نام دیے بغیر ہی عتاب وسزا ان سے ملحق کر دی جاتی ہے۔ یہ بھی عمومی تجربے کی بات ہے۔

اب ہمیں جو صورتِ حال درپیش ہے اور جس کی طرف توجہ مبذول کرانے کے لیے یہ مضمون لکھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہماری اصلاحی تحریکوں اور فلاحی اداروں نے دانستہ طور پر خود کو قانون کے دائرے سے باہر تصور کر لیا ہے اور اخلاق کا ایک تخفیف شدہ تصور اختیار کر کے اصلاحِ نفس اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں یوں مصروف ہیں کہ ایک طرف تو شریعت سے متصادم ریاستی قانون کی معاندانہ حیثیت مخفی رہتی ہے اور دوسری طرف اخلاق پر پابندی ایک کھیل بن کر رہ جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شرعی اخلاق نہ صرف احکام الٰہی سے منقطع ہو جاتے ہیں بلکہ یہ ریاستی قانون سے بھی جڑ جاتے ہیں اور یہ بات زیادہ خطرناک ہے۔ اس سے شریعت کا مسخ شدہ تصور تشکیل پا کر پختہ ہو جاتا ہے اور اصلاحی مساعی عین اس مقصد میں صرف ہونے لگتی ہیں جس سے گریز اور اجتناب کے لیے انہیں بروئے کار لایا جار ہا ہوتا ہے۔ نمایاں اور بھیانک خرابی اس تصور کا فروغ پانا ہے کہ شریعت نرمی اور رعایت کا نام ہے اور اس کا نفاذ واطلاق سے کوئی تعلق نہیں۔ شرعی اور اخلاقی امور کا مطلب بس یہی ہے کہ دل کرے تو عمل کر لیں نہ کرے تو چھوڑ دیں۔ نفاذ اور پابندی تو صرف ریاستی آئین وقانون کی ہوتی ہے اور یہ اچھی یعنی عین اخلاقی بات ہے۔ گویا اخلاق کا مطلب صرف یہی بن جاتا ہے کہ اخلاق منہدم کیے جائیں۔ پس شرعی اخلاق پسند وناپسند کا معاملہ ٹھہرتا ہے اور ریاستی قانون بھی عین اخلاق بن جاتا ہے اور پھر اس اخلاق کی پابندی بھی ہوتی ہے۔ یوں نہ صرف اخلاق کے متعلق رویہ بدلتا ہے بلکہ اخلاق کا تصور ہی الٹا اور اضافی (ریلیٹو) ہو جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر خرابی کی صورت کیا ہوگی؟

اخلاق وقانون کی علیحدگی اور تمیز کا سلسلہ شاید اصلاحی ورفاہی تحریکوں کے آغاز ہی سے ہو چکا ہو یا شاید اصلاحی تحریکیں اس سوچ اور تصور کی پیداوار ہوں، بہر حال یہ تاریخی تحقیق کا

موضوع ہے۔ میری پریشانی کا موجب موجودہ صورتِ حال ہے۔ اصلاحی ورفاہی تحریکیں اور ادارے انذار، سزا اور سخت گیری کے پہلو کو نظر انداز کرنے کی غلطی کا ارتکاب تو کرتے ہی ہیں الٹا اس پر فخر بھی محسوس کرتے ہیں۔ نرمی اور رعایت کے ساتھ کام کرنے کا اصول سماجی کاموں کی نوعیت پر منحصر نہیں بلکہ سماج میں ان کی اجنبیت اور لاتعلقی اور سماجی نفسیات سے ان کی لاعلمی پر مبنی ہے۔ یعنی خود ساختہ جزوی اصول (انذار سے گریز) حکمت عملی یا مجبوری نہیں بلکہ اصل الاصول بن چکے ہیں۔ یہ چیز معتزلی اصولِ عدل کا چربہ ہے اور نہایت بھونڈا چربہ ہے۔ مثلاً جب یہ اصول ہے کہ لوگوں کے ساتھ نرمی اور رعایت کرنی ہے تو پھر اس اصول کو معیار بنا کر اسی اصول کے اطلاق میں نرمی اور رعایت انتہائی غلط بات ہے۔ نرمی برتنے کا اصول برتنے میں نرمی مضحکہ خیزی کے سوا کچھ نہیں۔ نرمی کے اصول پر سختی ہونی چاہیے تبھی نرمی برتی جاسکے گی۔ رعایت کے اصول میں رعایت یا نرمی کے اصول میں نرمی اصلاً تو سختی ہے لیکن یہ سختی کارکنان پر منتقل ہوجاتی ہے اور عامۃ الناس سے ناروا امتیاز ہونے لگتا ہے۔ کارکنان مایوس اور مخمصے کا شکار اور اصلاحی عمل بے اعتبار ہوجاتا ہے۔ نتیجہ صفر نہیں بلکہ منفی نکلتا ہے۔ سارے کام نشست و برخاست اور شغل بے مقصد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اخلاق وقانون کی باہمی پیوست اور اخلاق کے نفاذ میں جبر کی مثال منکرین زکوٰۃ کے خلاف حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ کا عمل مبارک ہے۔ ایک رسی کے معاملے میں بھی نرمی نہیں برتی جارہی اور انہیں انفرادی فیصلے کے لیے نہیں چھوڑا گیا۔ وجہ یہی ہے کہ زکوٰۃ صاحبِ نصاب پر فرض ہے۔ غیر نصابی فرد پر زکوٰۃ واجب نہ ہونا ہی رعایت اور اخلاق کی عملداری ہے۔ صاحب نصاب پر سختی ہی سختی ہوگی اور واضح طور پر ہوگی۔ صاحب نصاب سے زکوٰۃ لینے میں نرمی برتنے کا مطلب یہی ہے کہ غیر نصابی کو ملنے والی رعایت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ دوسری صورت میں سمجھیے تو ڈھائی فیصد شرح ایک رعایت اور نرمی ہے۔ اس میں کمی نرمی نہیں بلکہ ظلم ہے۔ جب اس قسم کی نرمی برتی جاتی ہے تو شخصی مسائل پیدا ہوتے ہیں اور اصلاح کا عمل سماجی نہیں رہتا بلکہ انتخابی وذاتی بن جاتا ہے۔ ہماری اصلاحی تحریکیں اسی بنیادی غلطی کا شکار ہیں کہ سماجی واجتماعی اصلاح کے نام پر جو طریقہ اختیار کرتی ہیں وہ سماجی جڑاؤ کی بجائے سماجی انتشار اور تفرقہ کا باعث بن جاتا ہے۔

یہ سمجھنا چاہیے کہ سزا کے بغیر جزا اور سختی کے بغیر نرمی بے معنی بات ہے۔ ثواب اور عذاب

اسی لیے ہیں۔ نرمی کے ساتھ سختی بھی ہے۔ ثواب اور نرمی کا چناؤ غلط حکمت عملی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بھی انسانوں کے لیے اسی دنیا میں انذار، عتاب، عذاب اور سزا رکھی ہے۔ رسول کریم ﷺ بشیر ہیں تو نذیر بھی ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ کے عمل میں حکمت نہیں جو ہم اپنی الگ حکمت عملی اختیار کررہے ہیں؟ اخلاقی بحالی اور اصلاح کا کام کرنا ہے تو انذار کا ناگزیر عمل لازمی اختیار کیا جائے ورنہ اخلاق پر عمل تو کیا اس کے تصور سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ انذار اور تنفیذ کا عنصر شامل کر کے شریعت کی مکمل تصویر پیش کریں۔ ابھی ہم جو کام کررہے ہیں وہ سسٹم کی گندگی اٹھانے کے علاوہ کچھ نہیں اور کتنے دکھ کی بات ہے کہ اس کچرا برداری کے عوض ہم اچھی جزا کی امید خدا سے لگائے بیٹھے ہیں۔

بہرحال، تمام فلاحی و رفاہی کام تب تک اخلاق کش رہیں گے جب تک ان میں نفاذ و تنفیذ کا رنگ غالب نہیں ہوگا اور احکام کی پابندی کو کم از کم طور پر ریاستی قانون پر پابندی کے مماثل تصور نہیں کیا جائے گا۔ قانون کہیں یا اخلاق، صبر کے ساتھ ساتھ جبر کا دامن مت چھوڑیں۔ بصورت دیگر یہی کہا جا سکتا ہے کہ ''بھلّے کھان نوں باندری تے ٹُھبے کھان نوں رِچھ۔'' (یعنی نعمت کے مزے کوئی اور لے جبکہ عذاب جھیلیں ہم)۔

تبصرہ: ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

صابر علی صاحب جو بنیادی بات کہہ رہے ہیں وہ سو فیصد درست ہے۔ ہمارا اخلاقی کام اسلامی انقلابی جدوجہد سے قطعاً لاتعلق کر دیا گیا ہے۔ اصولاً رفاہی کام کو ریاست درونِ ریاست بنانے کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ یہ کام بڑی حد تک علمائے ایران نے انقلاب سے قبل انجام دیا تھا اور آج تحریک حزب اللہ جنوبی اور مشرقی لبنان میں انہی کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔

انقلابی تحریکیں جو رفاہی ادارتی صف بندی کرتی ہیں اس کے نتیجے میں سامراجی اقتدار مائیکرو سطح پر معطل ہو جاتا ہے اور سرمایہ دارانہ سامراجی اخلاقیات کی تنفیذ مشکل سے مشکل ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ شریعت کو مائیکرو سطح پر نافذ کرنے کا عملی طریقہ ثابت ہوا ہے۔ جزاک اللہ! آپ نے اپنے گراں قدر مضمون میں اس عمل کی نظریاتی بنیادیں وضع فرمائی ہیں۔

(بقیہ صفحہ نمبر: ۹)

تفہیم دین مدیر

تجدد گمراہی ہے اور قابل ردّ ہے

تجدد کو قبول کرنا اور تجدد کو قبول کرنے کا ماحول بنانا بھی قابل مذمت ہے

تجدد کیا ہے؟ اجتہاد اور عصری تقاضوں کے نام پر غیر اسلامی افکار وتصورات سے متاثر ومرعوب ہوکر دینی تعلیمات کی ایسی تشریح وتاویل کرنا، نئے مسائل کا ایسا حل پیش کرنا جس سے صحیح اسلامی سپرٹ اور مقاصد شریعت کی نفی ہوتی ہو اور غیر اسلامی افکار وتصورات کو فروغ حاصل ہوتا ہو۔ اگرچہ عالمی سطح پر ایک زمانے میں سوشلزم اور پاک وہند میں ہندو تہذیب بھی ایسے غیر اسلامی افکار میں شامل رہی ہے جس سے متجددین مستفید ہوئے ہیں لیکن ہمارے عہد کا سب سے بڑا طاغوت مغرب کی الحادی فکر وتہذیب ہے جو بلاشبہ دینِ کفر اور دین غیر اللہ ہے۔ یہ تہذیب توحید ورسالت کی منکر ہے، آخرت کی منکر ہے۔ اور صرف انسان کو، اس کی خواہشاتِ نفس کو اور اس کی عقل وتجربات کو ''حق'' قرار دیتی ہے، اسے ہی حتمی علم سمجھتی ہے۔ یہ وحی اور قرآن کی منکر ہے، مذہب کا انکار کرتی ہے، مادہ پرستی کی علمبردار ہے۔ حبّ دنیا اور حبّ جاہ ومال کی مؤید ہے، انسان کو الٰہ قرار دیتی ہے اور ہر لحاظ سے اسلام کی ضد ہے۔

اور اس سے بڑھ کر یہ کہ مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کے علمبردار مغربی ممالک (یورپ اور ان کا سرخیل امریکہ) اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ انہوں نے پہلی جنگ عظیم کے بعد خلافت ختم کی۔ مسلمان ملکوں کو ٹکڑوں میں بانٹ کر، غلام بنا کر، باہم تقسیم کر لیا۔ انہوں نے غلامی کی پچھلی صدی میں مسلم معاشرے اور ریاست کو ختم کر کے اپنے اجتماعی ادارے قائم کیے اور مسلمانوں کو ہمیشہ فکری اور عملی غلام رکھنے کی مضبوط پلاننگ کی۔ ان کی پوری کوشش ہے کہ کوئی مسلم معاشرہ اور ملک اسلام کی طرف مراجعت نہ کرے، ترقی نہ کرے، سر اٹھا کر نہ جیے۔ جو ایسا کرتا ہے مغرب اسے اپنے حربی، مالی، سیاسی، علمی، تہذیبی اور ثقافتی تفوق سے کچل دیتا ہے۔ عراق، افغانستان، لیبیا کا حشر ہمارے سامنے ہے۔ شام اور یمن اجڑ رہے ہیں۔ پاکستان اور ایران کے خلاف سازشیں عروج پر ہیں۔

ان حالات میں مغربی فکر وتہذیب کی حمایت کرنا، اس سے مرعوب ومتاثر ہوکر اس کے گن گانا، اس کے مطابق اسلامی احکام کی تشریح وتاویل کرنا گویا اسلام دشمنوں کی فکری وعملی غلامی کو قبول کرنا ہے۔ یہ مسلمانوں کو زوال کے گڑھے سے نکلنے نہ دینا ہے۔ یہ مسلمانوں کو نامسلمان بنانے میں مدد دینا ہے۔ یہ صریح گمراہی ہے اور جو اپنے ذاتی، گروہی اور مالی مفاد کے لیے ایسا کرتا ہے وہ مسلمانوں کا دشمن اور اسلام کا غدار ہے۔

تفہیم دین

حافظ محمد عمران طحاوی[1]

مسلمان اور فکری پسماندگی

مشہور الجزائری مفکر مالک بن نبی (ف ۱۹۷۳ء) نے ایک جگہ لکھا ہے:

"وسنظل نكرر ونلح فی تكرارنا ان ازمة العالم الاسلامی منذ زمن طويل لم تكن ازمة فی الوسائل وانما فی الافكار ومالم يدرک هذا العالم تلک الحقيقة ادراكا واضحا فسيظل داء الشبيبة العربية الاسلامية عضالا بسب تخلفها عن ركب العالم المتقدم۔"

"ہم اصرار اور تکرار کے ساتھ یہ بات کہتے رہیں گے کہ طویل مدت سے عالم اسلام کو جس بحران کا سامنا ہے اس کا تعلق وسائل سے نہیں افکار سے ہے۔ جب تک دنیا اس حقیقت کو بخوبی نہ سمجھ لے اس وقت تک ناتجربہ کار عرب اسلامی ملکوں کو لاحق ہونے والا مرض، ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں اس کے بہت پیچھے رہ جانے کی بنا پر لاعلاج بنا رہے گا" (مشكلة الثقافة، ص ۱۷۷)۔

مالک بن نبی کی یہ بات قابل غور وفکر ہے۔ اگرچہ اصحاب علم ودانش کا ایک طبقہ شد ومد کے ساتھ اس کا قائل رہا ہے اور مسلمانوں کی تہذیبی پسماندگی کو ان کی فکری پسماندگی کی شکل میں دیکھتا رہا ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ مسلم اصحاب علم وفکر کی اکثریت جس میں روایت پسند علما اور اسلام پسند سرفہرست ہیں، مسلمانوں کے تہذیبی زوال کی مغربی استعمار اور اس کی سازش کے تناظر میں تعبیر کرتے رہے ہیں۔ لیکن مالک بن نبی جیسے مفکرین کی نگاہ میں اصل مسئلہ استعمار کا نہیں، قابلیت استعمار کا ہے۔ (شروط النهضة :152۔155) یہ دراصل مسلم دنیا کی وہ داخلی کمزوری (استعمار کو قبول کرنے کی صلاحیت) تھی جس نے مسلم دنیا میں استعمار کی راہ ہموار کی۔ مالک بن نبی کا قابلیت استعمار (قابلية للاستعمار) کا نظریہ بہت اہم ہے۔ انہوں نے 'شروط النهضة' میں اس کے اہم نکات پر روشنی ڈالی ہے اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب تک مسلمانوں کے اندر سے استعمار کو قبول کر کے اپنے اوپر اس کو مسلط کر لینے کی کمزوری ختم نہیں ہوتی اس وقت تک وہ استعمار کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتے۔

---

[1] پی ایچ ڈی سکالر، یونیورسٹی آف لاہور

مالک بن نبی کی نظر میں اسلامی تہذیب کی تشکیل وفروغ کا مسئلہ اسلامی فکر سے مربوط ہے۔جب تک مسلمان فکری سطح پر خود کو مستحکم نہیں کرتے،اس وقت تک وہ ایک مضبوط تہذیب کی تشکیل میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔گویا یہ ایک طرح سے مسلمانوں کو لاحق فکری بحران ہے جس نے سماجی،سیاسی،معاشی اور دیگر سطحوں پر مختلف النوع مسائل ومشکلات کی پیدائش وافزائش میں اہم کردار ادا کیا ہے۔اس فکری بحران کی شروعات کیسے اور کہاں سے ہوئی؟اس پر مختلف آرا ہیں۔اور ہر رائے کے حاملین اپنے دلائل رکھتے ہیں۔خاص اس موضوع پر ایک کتاب 'ازمة العقل المسلم' کے نام سے عبدالحمید احمد ابوسلیمان(پ1936ء)نے لکھی ہے۔انہوں نے اس کتاب میں مسلمانوں کے فکری بحران کی دو بنیادی وجوہات بیان کی ہیں:ایک خلیفہ ثالث سیدنا عثمانؓ کے محاصرہ اور شہادت کے بعد اسلامی فوج کا قبائلی عصبیت رکھنے والے عرب بدؤوں کے کنٹرول میں آجانا جنہوں نے حجاز میں موجود اسلامی فکر وتہذیب کی اصل نمائندہ طاقتوں کو پسپا کردیا۔اور دوسری وجہ اس تغیر کے نتیجے میں اسلام کی سیاسی اور فکری قیادت کا دو حصوں میں منقسم ہوجانا ہے۔چنانچہ پورے اموی وعباسی دور میں اسلام کی فکری اور سیاسی نمائندگی کرنے والے دونوں طبقوں کے درمیان زبردست کشمکش جاری رہی جس کے نتیجے میں اصحاب علم وفکر کا طبقہ بالجبر اجتماعی ذمہ داریوں سے کنارہ کش اور سیاسی طبقہ ان کے تعاون سے محروم ہوگیا(ازمة العقل المسلم،ص،48-49)۔

مختار فاروقی بھی چل بسے

پچھلے کچھ عرصے میں بے شمار علماء کرام اور اسلامی دانشور ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ان میں تازہ اضافہ ماہنامہ'حکمت بالغہ'جھنگ کے مدیر انجینئر مختار فاروقی صاحب کی رحلت ہے۔اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے اور ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے۔مرحوم نے نہ صرف قرآن اکیڈمی جھنگ کی تاسیس اور اسے خدمت قرآن کے لیے فعال رکھنے میں بنیادی کردار ادا کیا بلکہ حکمت بالغہ کے ذریعے دعوت الی اللہ اور قرآنی تعلیمات کو جدید طبقوں تک پہنچانے کے لیے سرگرمی سے کام کیا۔مرحوم تاریخ کا بہت عمدہ ذوق رکھتے تھے اور ان کی تحریروں اور حکمت بالغہ کے ضخیم نمبروں میں ان کی یہ انفرادیت ان کے کام کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهٗ وَارْحَمْهُ وَعَافِهٖ وَاعْفُ عَنْهُ.

افغانستان ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

امارتِ اسلامیہ افغانستان

ہیومن رائٹس، میڈیا کی آزادی اور حقوق نسواں کے بارے میں پالیسی کیا ہونی چاہیے؟

افغانستان پر سامراجی غلبہ کی جدوجہد ختم نہیں ہوئی بلکہ ایک نئے مرحلہ میں داخل ہوگئی ہے۔ اب سامراج کی کوشش یہ ہوگی کہ امارت اسلامیہ کو ایک سرمایہ دارانہ ریاست بنا کر اس کو عالمی سرمایہ دارانہ سامراجی نظام میں ضم کر لے۔ اس نئی سامراجی یلغار میں سامراج جو نظریاتی ہتھیار استعمال کرے گا وہ ہیومن رائٹس کی پابندی پر اصرار ہے۔ اگر ہم اس محاذ پر پسپا ہو گئے تو گاہے گاہے افغان جہاد کے تمام ثمرات ہاتھ سے دھوتے چلے جائیں گے۔

ہیومن رائٹس کی حقیقت

ہیومن رائٹس کا نظریہ سترھویں صدی کے یورپ کی ایجاد ہے اور ہیومن رائٹس سرمایہ داری کے کلمہ خبیثہ لا الہ الا الانسان کی تشریح ہیں۔ اسی نظریاتی بنیاد پر سرمایہ دارانہ جمہوریتیں قائم ہوتی ہیں۔ یہ جمہوریتیں لبرل بھی ہو سکتی ہیں اور استبدادی بھی مثلاً چین۔ یہ دونوں قسم کی جمہوریتیں ہیومن رائٹس کے تقدس کو تسلیم کرتی ہیں۔ ہیومن رائٹس کے تقدس کو تسلیم کرنا ایک سرمایہ دارانہ جمہوری ریاستی نظام کے قیام کی طرف پہلا قدم ثابت ہوتا ہے۔

فلسفہ ہیومن رائٹس کا ایک اہم موجد سترھویں صدی کا مفکر جان لاک ہے۔ اس نے جس بنیادی مفروضہ پر ہیومن رائٹس کا نظریہ واضح کیا وہ یہ ہے کہ انسان اپنے جسم اور تمام جسمانی قوتوں کا خود خالق اور مالک ہے۔ اور اس کا حق اور فرض یہ ہے کہ ان جسمانی قوتوں کو اس طرح استعمال کرے کہ اس کے تصرف فی الارض میں لامتناہی اضافہ ہوتا چلا جائے۔ تصرف فی الارض کا ذریعہ بڑھوتری سرمایہ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

لاک اور اس کے جدید سامراجی پیروؤں کے مطابق انسان کا حق اور فرض ہے کہ اپنی جان، املاک اور رائے کو بڑھوتری سرمایہ کے لیے وقف کر دے۔ ہیومن رائٹس وہی حقوق ہیں جو ہر فرد کو انفرادی طور پر اپنی جان، املاک اور رائے کو بڑھوتری سرمایہ کے لیے وقف کرنے کا مکلف بناتی ہیں۔ ہر سرمایہ دارانہ ریاست سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ہیومن رائٹس کو فروغ دے کر محکم قانون

سرمایہ کو یقینی بنائے۔ تفصیل اس اجمال کی ہماری کتاب Capitalist Values and Ideologies کے ضمیمہ ۵ میں بیان کی گئی ہے۔

سامراج اپنا یہ حق محفوظ رکھتا ہے کہ جو لوگ ان ہیومن رائٹس کو نہیں مانتے یعنی جو اپنی جان، املاک اور رائے کو بڑھوتری سرمایہ کے لیے وقف نہ کریں انہیں وہ بے دریغ قتل کرے اور ان پر تحکم قانون سرمایہ یعنی جمہوریت مسلط کر دے۔ اسی غلط عقیدہ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے امریکا نے آٹھ کروڑ قدیم باشندوں (ریڈ انڈینز) کو قتل کیا اور اس وقت کے سرمایہ دارانہ مفکرین مثلاً جیفرسن، ہیگل اور لاک وغیرہ نے اس عمل کو خوب سراہا۔

اسی غلط نظریہ پر عمل پیرا رہ کر امریکا نے اکیس سال تک افغانستان میں قتل و غارت اور لوٹ مار جاری رکھی اور تحکم قانون سرمایہ ملک پر مسلط کر دیا۔ اس سے بڑی ستم ظریفی اور کیا ہو گی کہ جس غلط نظام تحکم کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے مجاہدین اسلام نے عدیم المثال قربانیاں دی ہیں اسی غلط نظام کی تشکیل نو کی طرف اب طالبان حکومت مراجعت کرے۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ طالبان نے جہاد فی سبیل اللہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں اپنا حصہ محفوظ کر کے شامل ہونے کے لیے نہیں کیا جیسا کہ کل ویٹ کانگ نے کیا تھا اور آج کولمبیا میں فارک کے گوریلے کر رہے ہیں۔ طالبان کا مقصد سرمایہ دارانہ نظاماتی احیاء نہیں (جیسا کہ قوم پرستوں اور اشتراکیوں کا ہمیشہ ہوتا ہے) ان کا مقصد سرمایہ دارانہ نظام کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی تسخیر ہے۔

امارت اسلامیہ میں ہیومن رائٹس کے غلط نظریہ پر عمل درآمد کی کوئی گنجائش نہیں۔ بلکہ دشمن کے اسی نظریاتی ہتھیار کو جو لوگ استعمال کر کے ملکی سالمیت کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ان کو سخت ترین سزائیں دینی چاہئیں۔ بنیادی طور پر یہ دو گروہوں پر مشتمل ہیں:

میڈیا کی آزادی کی دہائی دینے والے

پینٹاگون کے عبوری تخمینہ کے مطابق 80 ہزار سے ایک لاکھ تک افغانیوں نے امریکی قوت کا براہ راست ساتھ دیا۔ یہ افغانستان کی مجموعی آبادی کا تقریباً اعشاریہ صفر تین فیصد بنتا ہے (مقبوضہ ویت نام کے مقابلہ میں یہ تعداد بہت کم ہے)۔ اس کے علاوہ سامراج کے حلیف اعلیٰ سرکاری نوکر شاہی، فوج، سرمایہ کاروں، اساتذہ اور دہریہ مفکرین میں بھی موجود ہیں۔ یہ سب آزاد

میڈیا کے فروغ کے متوقع حمایتی ہیں۔

میڈیا کی آزادی کا مطلب اس کو اس بات کی کھلی چھٹی دینا ہے کہ سامراجی سرمایہ داری کی وکالت کرتا رہے۔ یہی کردار افغان سرکاری اور نجی میڈیا بالخصوص ٹی وی چینلز 2001ء سے لے کر 2021ء تک ادا کرتے رہے ہیں اور دونوں پر سامراجی سرمایہ دارانہ تسلط مستحکم رہا ہے۔ اس طریقہ کار کو سرکاری طور پر برداشت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ طالبان سامراجی تخریب کاری کا راستہ کھلا چھوڑ دیں۔ ان کی میڈیا پالیسی کا مقصد تخریب کاری کے اس سامراجی دروازہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دینا ہونا چاہیے تا کہ تحکم سرمایہ (یعنی جمہوری نظام) کے دوبارہ قائم ہونے کے تمام امکانات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔

لہٰذا طالبان کی میڈیا پالیسی کے اجزا حسب ذیل ہونے چاہئیں:

۱۔ تمام میڈیا اداروں کو فی الفور قومیا لیا جائے۔

۲۔ تمام غیر ملکی صحافیوں کو فوراً ملک بدر کر دیا جائے۔

۳۔ نشریات پر علما کی ماتحتی میں اسلامی اصولوں کے مطابق سنسر شپ کا نفاذ

۴۔ تمام انٹرنیٹ سروسز پر سرکاری نگرانی اور کنٹرول کا انتظام

۵۔ ایک ملک گیر انٹرنیٹ سرور پلیٹ فارم کا قیام

۶۔ دیہی اور مضافاتی علاقوں میں قومی انٹرنیٹ سروسز کی فراہمی کا انتظام

عورتوں کی سرمایہ دارانہ آزادیوں کی دہائی دینے والے

آج سامراج سب سے زیادہ زور افغان عورتوں کو گھر سے نکال کر بازار میں بٹھانے پر دے رہا ہے۔ عورتوں کی ملازمت کو فروغ دینا سرمایہ دارانہ معاشرت اور اس سے ملحقہ عریانی اور فحاشی پھیلانے کا کلیدی ذریعہ ہے۔

اس کا تلخ ترین تجربہ ہمیں ایران میں ہوا ہے اور ہو رہا ہے جہاں انقلابی دور کی ابتداء سے آج تک حکومت اور علما نے عورتوں کی ملازمت کے ضمن میں رخصت کا رویہ اختیار کیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ایران میں عیاشی اور فحاشی ایک سیلاب کی طرح امڈ آئی ہے اور یہ اسلامی ریاست کے لیے سب سے بڑا معاشرتی چیلنج بن گیا ہے۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے اور عورتوں کو سمجھا دینا چاہیے کہ تحریک نسوانیت دراصل ردِ نسوانیت کی تحریک ہے جو عورتوں سے ان کی نسوانیت چھین کر ان کو بڑھوتری سرمایہ کا آلہ کار بنانے کی جستجو کرتی ہے۔ پوری اسلامی تاریخ میں ہم نے کبھی بھی کسب معاش کو نہ عورتوں کا حق گردانا نہ فرض۔ یہ اس لیے کہ چادر اور چار دیواری کا تقدس قائم رہے اور اسلامی خاندانی نظام اور روایات محفوظ رہیں۔

اپنے دور تسلط میں سامراجی تحکم کی ایک اہم کامیابی یہ ہے کہ افغان خواتین کی ایک بڑی تعداد کو اس نے کسب معاش پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ نظام افغان قبائلی روایات کے بالکل خلاف ہے اور اس کی روک تھام میں ہمیں یقیناً معاشرتی تعاون حاصل ہوگا۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل پالیسیوں پر عمل درآمد ممکن ہے:

۱۔ سرمایہ دارانہ (صنعت و مواصلات) اور سرکاری شعبوں میں عورتوں کی نئی ملازمتوں کی فراہمی پر پابندی بالخصوص اعلیٰ عہدوں پر۔

۲۔ آجروں اور مینجروں کو اس بات پر راضی کیا جائے کہ وہ عورتوں کی کل وقتی ملازمت کو جز وقتی ملازمتوں میں تبدیل کریں۔

۳۔ ملازم خواتین کی وضع قطع اور نشست و برخاست میں شرع مطہرہ کی تعلیمات پر عمل درآمد کا ملازمت فراہم کرنے والا ادارہ ذمہ دار ہو اور اس کی حتی الوسع ریاستی نگرانی کی جائے۔

۴۔ انٹرنیٹ کے ذریعہ ملازمت فراہم کرنے والے اداروں کو عورتوں کے کام کو دفتر میں نہیں بلکہ گھروں اور قبیلوں میں منظم کرنے کی ترغیب دی جائے۔

۵۔ عورتوں کی تعلیم اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی بجائے مدارس میں منظم کی جائے۔

۶۔ صرف میڈیکل تعلیم غیر مدارس تعلیمی اداروں میں منظم کی جائے۔ اس میں اعلیٰ ثانوی تعلیم کی فراہمی کا بھی انتظام ہو۔

یہ سب انقلابی اقدام ہیں اور ان کا مقصد ایک غیر سرمایہ دارانہ غیر جمہوری معاشرت اور ریاست کی بنیادیں فراہم کرنا ہے۔ طالبان کو اور افغانستان کے دیگر اسلامی گروہوں کو احساس ہونا چاہیے کہ جہاد ختم نہیں ہوا بلکہ تعمیر ریاست اور تعمیر معاشرت کے کٹھن مرحلہ میں داخل ہو گیا ہے۔ طالبان مکی دور سے گزر کر مدنی دور میں داخل ہو گئے ہیں اور مدنی دور جہاد کے تسلسل کا دور ہے۔

افغانستان		سید خالد جامعی

طالبان کا افغانستان

طالبان کا اصل کارنامہ۔مغربی تصورات کے مطابق معاشی ترقی مطلوب ہی نہیں

طالبان کا اصل کارنامہ

طالبان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مغرب کے عقیدے، اس کے اصل علم سائنس وٹیکنالوجی کو شکست دے کر یہ ثابت کردیا کہ سائنس وٹیکنالوجی کا مقابلہ سائنس وٹیکنالوجی کے بغیر بھی کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے ثابت کیا کہ اصل چیز اسباب نہیں مسبب الاسباب ہے، اللہ کی نصرت ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ حی وقیوم ہے، وہ کائنات میں اہل ایمان کی نصرت فرماتا ہے۔ طالبان نے ان اسلامی مفکرین وعلماء کے عقیدے کی اصلاح کی جو سو برس سے بتارہے تھے کہ مغرب سے مغرب جیسی سائنس وٹیکنالوجی اور اسلحہ حاصل کیے بغیر مغرب کو شکست نہیں دی جاسکتی یعنی امت کا ایمان اسباب اور وہ بھی کفار سے حاصل کردہ اسباب سے متعلق کردیا گیا تھا۔ طالبان نے اس عقیدے کی اصلاح کی۔

اس دور میں اعتقادی بنیاد پر مغرب سے جنگ لڑنے کا کارنامہ طالبان نے انجام دیا اور اسے علمی واعتقادی، نظریاتی، مابعد الطبیعیاتی سطح پر عبرت ناک شکست دی۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ مدمقابل طاقت اور قوت کو جب اعتقادی شکست دی جاتی ہے تو عسکری فتح خود بخود حاصل ہو جاتی ہے۔ طالبان کی فتح صرف عسکری نہیں علمی، اعتقادی، نظریاتی، مابعد الطبیعیاتی دائروں کی فتح ہے۔ دنیا کی کسی اسلامی تحریک نے مغرب کو ان تمام دائروں میں شکست نہیں دی۔ طالبان نے کوئی کتاب نہیں لکھی، علمی مباحث نہیں کیے، لٹریچر پیدا نہیں کیا۔ انہوں نے انبیاء کے طریقے پر کام کیا۔ صحابہ کا راستہ اختیار کیا۔ انبیاء اور صحابہ نے کتابیں نہیں لکھیں انہوں نے انسان تیار کیے۔ طالبان نے بھی ایسے انسان تیار کیے جو خاک وخون اور آگ میں جلنے کے بعد کندن بن کر نکلے۔ انہوں نے اپنے ایمان سے ثابت کردیا ہے کہ اللہ کی مدد کس طرح آتشِ نمرود کو گلزار بن سکتی؟

خیر القرون میں کسی صحابی نے کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن روم وایران کو فتح کرلیا۔ کتاب کے بغیر، سب سے زیادہ علم، علم کا سمندر، علم کا ماخذ خیر القرون میں ہی موجود ہے۔ عالم وہ نہیں جو

کتابوں کے انبار میں کھو جائے۔ عالم وہ ہے جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہو۔ یہ قرآن کی نص ہے۔ عصر حاضر میں علمیت ناپنے کا پیمانہ کتابیں اور مقالات ہیں۔ عالم صرف وہ ہے کہ جب کوئی شخص اس کی صحبت میں بیٹھ کر اُٹھے تو اسے دنیا کی ہر شے حقیر تر نظر آئے، دنیا مری ہوئی بکری سے زیادہ مکروہ نظر آئے اور آخرت اس کے دل پر غالب آجائے۔

علم نور ہے، الفاظ کا ظہور نہیں۔ وہ علم جو عمل سے منقطع ہے وہ فرد کے نفس میں انقلاب پیدا نہیں کر سکتا تو وہ آفاق میں انقلاب کیسے پیدا کر سکتا ہے؟ علم اور عالم صرف وہی ہے جو انفس و آفاق کو تہہ و بالا کر دے اور پوری کائنات کو ربّ کے حضور سجدہ کرنے پر مجبور کر دے۔

مغربی تصورات کے مطابق معاشی ترقی مطلوب نہیں

ابھی تک طالبان رہنماؤں کے جو بیانات آئے ہیں ان میں ایک ہی مؤقف بار بار دہرایا گیا ہے کہ افغانستان کے تمام طبقات مل جل کر افغانستان کی معاشی ترقی اور خوش حالی کے لیے جدوجہد کریں۔ یہ بھی کہا جارہا ہے کہ دو کروڑ سے زیادہ لوگ خط غربت سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دوسرے معنوں میں مغربی اصطلاح ''ویلفیئر اسٹیٹ'' ایک معیار کے طور پر تسلیم کی جارہی ہے اور مغربی اصطلاحات کو درست تسلیم کیا جارہا ہے جبکہ یہ اصطلاحات آفاقی نہیں مقامی، علاقائی اور مغربی ہیں۔ اسی لیے عالمی کانگریس کا صدر ہزرل جدید سائنس کو یورپی سائنس کہتا ہے۔ دنیا میں ماحولیاتی تباہی یورپی سائنس نے پھیلائی لیکن اس کی قیمت پوری دنیا سے وصول کی جارہی ہے۔

امارتِ اسلامی افغانستان کا اصل مقصد ترقی، خوش حالی اور فارغ البالی نہیں بلکہ ایسا ماحول مہیا کرنا ہے جس میں ایسے نفوس قدسیہ تیار ہوں جو آخرت میں کامیاب ہو سکیں اور اللہ کی جنت میں داخل ہو سکیں۔ ہمیں ترقی اور تعلیم یافتہ نہیں ہدایت یافتہ افغانوں کی ضرورت ہے، جن پر رسالت مآب ﷺ فخر کر سکیں۔ اسلامی تحریکوں کا دنیا بھر میں یہی نعرہ اور یہی مقصد ہے کہ وہ اقتدار میں آکر معاشی ترقی اور خوش حالی کا انقلاب لائیں گی۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام آئے گا تو زیادہ ترقی ہوگی اور ہم مغرب سے ترقی میں آگے نکل جائیں گے۔ خمینی صاحب کے بارے میں ایمی چوا نے اپنی کتاب ''The World on Fire'' میں لکھا ہے کہ انہوں نے کہا ''ہم نے انقلاب تربوز کی قیمت کم کرنے کے لیے برپا نہیں کیا''۔ ظاہر ہے اس قول کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ انقلاب آئے گا تو تربوز کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا جائے گا۔ مقصود صرف یہ ہے کہ انقلاب ایمان، اخلاق اور روح میں تبدیلی کا نام ہے، معاشی مسائل حل کرنے کا نام نہیں، انقلاب کا مقصد لوگوں کو آخرت

میں کامیابی کے لیے تیار کرنا ہے نہ کہ انہیں بندۂ درہم و دینار، دنیا پرست بنانا۔

معاشی خوش حالی انقلاب کا ثمر ہوتی ہے اس کا مقصد نہیں کیونکہ قبر میں، حشر میں یہ سوال نہیں ہوگا کہ تمہارے ملک کا GNI,HDI,BMI/GDP اور GNP کیا تھا؟ وہاں یہ سوال بھی نہیں ہوگا کہ تم پیٹ بھر کھانا کھاتے تھے یا بھوکے رہتے تھے؟ تم کوٹھی میں رہتے تھے یا کوٹھڑی میں؟ تمہارا مادی منصب، مقام اور مرتبہ کیا تھا؟ تمہاری تنخواہ کتنی تھی؟ اور تمہارے حکمرانوں نے تمہیں سستا تربوز مہیا کیا تھا یا مہنگا تربوز؟ اذان دن میں پانچ مرتبہ فضاؤں میں بلند ہوتی ہے تو مؤذن یہی پکارتا ہے کہ دنیا کے تمام کام، مصروفیات اور مشغلے چھوڑ کر اپنے ربّ کی جنت کی طرف دوڑو، اللہ کے گھر کی طرف آؤ۔ لوگوں کو معاش، دنیا، مصروفیت اور دنیا کی مشغولیت سے نکال کر آخرت کی طرف، اللہ کی طرف اور اصل دنیا کی طرف بلایا جاتا ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ لوگ بھوکے تھے یا پیاسے؟ سوال یہ ہے کہ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے تو اپنے ربّ کے سامنے کھڑے ہونے کے قابل تھے یا نہیں؟ کیا اسلامی امارت نے انہیں وہ ماحول، مزاج، موسم، حالات اور اسباب فراہم کیے تھے جن کے ذریعے وہ فکرِ آخرت میں مصروف تھے یا نہیں؟ اور وہ اپنے نفس کا تزکیہ کر کے نفسِ مطمئنہ کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہے تھے یا نہیں؟ اس لیے اسلامی امارت روٹی، کپڑے اور معاش کے نعروں پر قائم نہیں ہوتی، اس کے وجود کا ایک ہی جواز ہوتا ہے کہ وہ بندوں کو اللہ کا نیک بندہ بننے کے لیے ماحول مہیا کرے۔ اسی لیے امیر اور خلیفہ کے خلاف خروج کی بنیادی شرط کفر بواح کا ارتکاب ہے۔

اسلامی علمیت میں اسی لیے معاشی، مادی اور دنیاوی معاملات میں غفلت کی بنیاد پر خروج نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے برعکس جان لاک کہتا ہے کہ ریاست کا اصل کام یہ نہیں کہ لوگوں کو دوزخ میں جانے سے روکے۔ اگر کوئی جہنم میں جانا چاہتا ہے تو جائے، ریاست کا اصل کام لوگوں کی زندگی، پراپرٹی اور لبرٹی کا تحفظ ہے۔ اگر ریاست ان تین مقاصد میں ناکام ہوجائے تو اسے جمہوری طریقے سے برطرف کر دیا جائے اور اگر ایسا کرنا محال ہو تو خونی انقلاب برپا کر دیا جائے۔ اسلام اور مغرب میں خونی انقلاب برپا کرنے کا منہاج کتنا مختلف ہے؟ امید ہے طالبان ان نکات کو پیشِ نظر رکھیں گے۔

تمام اسلامی تحریکیں دنیا اور ترقی کو مصلحتاً اپنا مرکز، محور، ہدف بنانے کی بجائے اپنے اقتدار کا مقصد آخرت کی کامیابی کو بنائیں۔ مغرب جانتا ہے کہ اسلامی تحریکوں کا خفیہ ایجنڈہ یہی ہے۔ جب وہ جانتا ہے تو ہمیں اس کا اعلان کرنے میں کیا مشکل درپیش ہے؟ اگر طالبان بھی دنیا کو یہ نہیں بتا سکتے کہ ہمارے انقلاب کا مقصد اور امریکہ کو شکست دینے کا مقصد فکرِ آخرت کا انقلاب برپا کرنا ہے تو پھر یہ بات کون کہہ سکے گا!

افغانستان ڈاکٹر محمد امین

افغان طالبان کو درپیش دو بڑے چیلنجز

مغربی تہذیب کا ردّ اور عوام کی ذہن سازی

اپنی حکومت کو تسلیم کرانا، عوام کو قحط سے بچانا اور ملک کو انتشار اور بدامنی سے بچانا طالبان کو درپیش فوری حل طلب مسائل ہیں جبکہ فکری، نظری اور عملی لحاظ سے جو بڑے مسائل طالبان افغان کو درپیش ہیں ان میں مغربی تہذیب کے نظریات اور اداروں کو قبول کرنے کا دباؤ اور افغان عوام کی دینی تعلیم و تربیت، فکری تطہیر اور اصلاح کے پہلو شامل ہیں۔ ہم طالبان کے فوری مسائل کے سرسری ذکر کے بعد فکری، نظری اور اصلاحی حوالے سے درپیش مسائل کا ذرا تفصیل سے ذکر کریں گے۔ اور جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں ہماری ان تحریروں میں اگر ایک طرف افغان طالبان کے لیے تجاویز ہیں تو پاکستانی عوام و خواص کے لیے بھی سوچنے اور غور کرنے کا مواد ہے۔

بیس سال کی ان تھک جدوجہد اور جان و مال کی بے مثال قربانیاں دے کر افغان طالبان اپنی اس تحریک مزاحمت میں کامیاب ہوئے ہیں جس کا ہدف امریکی و یورپی استعمار کو ملک سے نکالنا تھا۔ یہ بلاشبہ بہت بڑی کامیابی ہے اور امریکہ جیسی سپر پاور کو شکست دے کر ملک سے نکالنا ہرگز آسان عمل نہ تھا۔ تاہم یہ کامیابی حاصل کرنے کے بعد اور پورے افغانستان پر قبضے کے بعد اب دوسرا مرحلہ بھی کم مشکل، صبر آزما اور چیلنجنگ نہیں ہے کہ ملکی نظام حکومت کو اسلامی اصولوں کے مطابق کامیابی سے چلا کر دکھایا جائے اور لوگوں کو درپیش مسائل کو حل کیا جائے۔ سیاست، معیشت، معاشرت، تعلیم، قانون، میڈیا، تجارت، امن و امان غرض زندگی کے ہر شعبے میں مسائل کا ایک انبار ہے جو طالبان کی توجہ چاہتا ہے اور انہیں ہر مسئلے کو حل کرنا ہے لہٰذا ہر مسئلہ الگ توجہ کا محتاج ہے۔ ہم فوری حل طلب مسائل کے سرسری ذکر کے بعد اوپر ذکر کردہ دو اہم فکری و اصلاحی مسائل پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالیں گے:

فوری حل طلب مسائل

قحط کا خدشہ: قحط کا خدشہ حقیقی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ و یورپ جس نے جنگ میں طالبان سے شکست کھائی ہے وہ کیوں اسے سنبھلنے کا، زندہ رہنے کا اور استحکام کا موقع دیں گے بلکہ وہ تو سازشیں کریں گے اور جتنا ہو سکا علی الاعلان بھی مخالفت کریں گے جیسا کہ انہوں نے

افغان ریز رو منجمد کر دیے ہیں حالانکہ وہ افغانوں کے پیسے ہیں اور انہیں روکنے کا امریکہ کو کوئی حق نہیں۔ اگر خدانخواستہ قحط پڑتا ہے یا انتشار و بدامنی بڑھتی ہے تو پاکستان اور ہمسایہ ممالک لازماً متاثر ہوں گے۔ اس لیے پاکستان اپنے مفاد کی خاطر ان مسائل میں کچھ بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ چین اور روس کو بھی کچھ احساس ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ طالبان افغان پر خصوصی رحمت فرمائے گا اور یہ فوری مسائل ان شاء اللہ بتدریج حل ہو جائیں گے۔

امریکہ اور یورپ کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے اور دنیا کو (خصوصاً مسلم ممالک کو متحد ہو کر) انہیں باور کرانی چاہیے کہ بنیادی انسانی حقوق، جمہوریت اور خواتین کے حقوق کے بارے میں مغربی تصورات (جنہیں وہ اقوام متحدہ کے ذریعے آفاقی اور عالمی کہہ کر پیش کرتے ہیں) درحقیقت آفاقی اور عالمی نہیں ہیں۔ دیگر مذاہب اور معاشروں کے ان امور میں الگ اور مختلف تصورات ہیں لہٰذا وہ اپنی فکر و تہذیب کو زبردستی دوسروں پر نہ ٹھونسیں اور اپنی تہذیب کی گلوبلائیزیشن اور یونیورسلائیزیشن کی بجائے پلورل ازم اور تنوع کی حمایت کریں۔ چین اور روس جو نظامِ حکومت میں مغرب سے علی الاعلان اختلاف کرتے ہیں اور دنیا پر امریکہ و یورپ کی بالادستی تسلیم کرنے کو تیار نہیں، انہیں چاہیے کہ وہ امریکی و یورپی اقدامات اور رویے کی مذمت کریں۔ افغانستان میں طالبان کی حکومت کو تسلیم کریں اور اس کے استحکام میں معاونت کریں۔ ہم نے جن تین ہنگامی مسائل کا ذکر کیا ہے، ہمیں توقع ہے کہ ان شاء اللہ مستقبل قریب میں یہ تینوں مسئلے حل ہو جائیں گے یا ان کی جو موجودہ شدت برقرار نہیں رہے گی اور نئی افغان حکومت ٹھنڈے دل سے ملک کے دیرپا مسائل پر غور کرنے اور انہیں حل کرنے میں مصروف ہو جائے گی۔

مغربی تہذیب اور اس کے نظریات و اداروں کو قبول کرنے کا دباؤ

سوال یہ ہے کہ ہم مسلمان مغربی فکر و تہذیب کو قبول کیوں کریں جبکہ وہ دینِ کفر اور دین ماسوی اللہ ہے اور وہ اللہ، رسول، آخرت اور وحی کی ہدایت کو تسلیم نہیں کرتی۔ نیز اللہ و رسول نے فرمایا ہے کہ یہود و نصاریٰ مسلمانوں کے دشمن ہیں اور انہیں دین سے پھیرنا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کا اپنا تجربہ بھی یہی ہے کہ مغربی قومیں (خصوصاً امریکہ و یورپ) مسلمانوں کی دشمن ہیں لیکن اس سب کے باوجود تلخ حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی تہذیب اس وقت دنیا پر غالب ہے اور اس کی علمبردار مغربی قوتیں اسے ہر قیمت پر ساری دنیا خصوصاً مسلم ممالک میں غالب اور نافذ کرنا چاہتی

ہیں۔ مزید ستم یہ کہ اکثر مسلم ممالک کے حکمران ایسے ہیں جو مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب ہیں، بعض اس کے شائق ہیں اور ان پر مغربی قوتوں کا دباؤ بھی ہے لہٰذا اکثر مسلم معاشروں اور ملکوں میں مغربی فکر وتہذیب اور اس کے اصول واقدار رائج اور نافذ ہیں۔

ان حالات میں نہ صرف مغربی ممالک اور ان کے زیر اثر دنیا کے اکثر ممالک بشمول اقوام متحدہ اور اس کے ذیلی ادارے بلکہ مسلمان ممالک بھی سب طالبان بر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ وہ ''جمہوریت'' بحال کریں، انتخابات کرائیں، دوسرے سیاسی عناصر کو (خواہ وہ ان کے اور نفاذ شریعت کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں) حکومت میں شامل کریں، عورتوں کو بنیادی حقوق دیں (جو مغرب دیتا ہے)، میڈیا کو (مغرب کی طرح مادر پدر) آزادی دیں۔ معیشت میں مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام اور سودی بنکنگ وغیرہ رائج کریں اور تعلیم کو جدید مغربی خطوط پر منظم کریں، یونیورسٹیوں میں مخلوط تعلیم ہو، نصاب مغرب سے درآمد کردہ ہو وغیرہ۔

مسلمانوں نے مغربی تہذیب کے چیلنج کا جواب تین طرح سے دیا۔ بعض حکمرانوں نے اس سے مرعوب ہو کر اسے اپنا لیا جیسے ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا نے اور ایران میں رضا شاہ پہلوی نے اور علماء میں سے مرزا غلام احمد قادیانی نے۔ دوسرا ردّ عمل مفاہمت اور تلفیق کا تھا کہ بعض علماء نے اسلام اور مغربی تہذیب کے اصولوں کو ملا کر ایک ملغوبہ تیار کیا اور اسے اسلامی لحاظ سے قابل قبول قرار دے دیا، جیسے مغرب کی سیکولر، لبرل اور سرمایہ دارانہ جمہوریت میں کچھ اسلامی اصول داخل کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دے دیا۔ اور مغرب کی سودی بنکاری میں بعض اسلامی اصول داخل کر کے اسے 'اسلامی بنکنگ' قرار دے دیا۔ یہ بات اصولاً غلط تھی اس لیے کہ کفر اور اسلام کو یکجا کیا نہیں جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ ایک غالب تہذیب کے نظریات کو قبول کرتے وقت اگر کچھ کمی بیشی کر بھی لی جائے تو بالآخر غالب وہی آئے گی۔ چنانچہ جن مسلمان ملکوں نے بعض علماء کے کہنے پر 'اسلامی جمہوریت' کو قبول کیا، وہاں بتدریج سیکولرزم، لبرل ازم اور سرمایہ داری کے اصول غالب آ گئے، اسلام اور اس کے اصول واقدار غالب نہیں آئے۔

مغربی تہذیب کے خلاف تیسرا مسلم ردّ عمل یہ ہو سکتا تھا کہ مغربی تہذیب کے بنیادی اصول (ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم وغیرہ) چونکہ اسلام مخالف ہیں اور اس کا ورلڈ ویو (تصور الٰہ، تصور کائنات اور تصور انسان) بھی توحید، رسالت اور آخرت سے متضاد ہے لہٰذا اصولاً تو مغربی

تہذیب کو رڈ کر دیا جائے اور اسلامی اصولوں اور مسلم تجربات کو پیش نظر رکھتے ہوئے متعلقہ شعبے میں نیا نظام العمل وضع کیا جائے۔ یہ کام کرتے ہوئے اگر مغربی تہذیب کی کوئی ایسی چیز سامنے آئے جو مباح نوعیت کی ہو تو اسے اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھال کر قبول کیا جا سکتا ہے۔ جیسے مثلاً سیاست میں مغرب کی نیشنل ازم، ڈیموکریسی، نیشن سٹیٹ کو غیر اسلامی ہونے کی بناء پر رڈ کر دیا جائے اور قرآن و سنت، خلافت راشدہ، بعد کے نظام خلافت اور مسلم ممالک کی عصری ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے اجتہادی خطوط پر نیا اسلامی سیاسی نظام وضع کیا جائے۔ ایسا کرتے ہوئے اگر مغرب کے سیاسی نظام سے کوئی ایسا استفادہ کیا جا سکتا ہو جو مباح نوعیت کا ہو تو ایسا ممکن ہے۔

تاہم یاد رہے کہ ہم ڈیڑھ دو صدیوں تک مغرب کے غلام رہے ہیں اور اس عرصے میں اس نے ہمیں اپنا فکری غلام بھی بنا لیا۔ اور دوسری جنگ عظیم کے بعد اگرچہ اکثر مسلم ممالک بظاہر مغربی استعمار سے آزاد ہو گئے لیکن درحقیقت وہ آزاد نہیں ہوئے بلکہ استعمار نے 'امن کا چولا' پہن لیا اور مسلم معاشروں کی فکری غلامی، معاشی غلامی، سیاسی غلامی، ثقافتی و تعلیمی غلامی جاری رہی۔ اور آج بھی جاری ہے۔ لہٰذا ہمیں فکری طور پر ہوشیار اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے کہ کہیں ہم 'اجتہاد' کے نام پر پھر مغرب کی نقالی نہ شروع کر دیں۔ اسی لیے اقبال نے غلامی کے اجتہاد کو رڈ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز
بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم شعوری طور پر ہوشیار رہیں اور مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کے نظریات اور اداروں کو کسی رنگ میں اور کسی پہلو سے قبول نہ کریں بلکہ اپنا راستہ الگ نکالیں۔ افغانستان کے طالبان کو اللہ تعالیٰ نے یہ موقع دیا ہے کہ وہ آزادی سے سوچ سکتے اور عمل کر سکتے ہیں۔ انہوں نے کفر کو علی الاعلان میدانِ جنگ میں شکست دی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ امن کی حالت میں اس کی فکر و تہذیب سے شکست کھا جائیں۔ نہیں! انہیں امن کی حالت میں بھی مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کو علی الاعلان رڈ کر دینا چاہیے اور اسلامی اصولوں کے مطابق اپنی راہ الگ نکالنی چاہیے۔ اور ساری دنیا کے مسلمانوں کو خصوصاً ان کے اہل علم کو اس کام میں ان کی مدد کرنی چاہیے۔

مغربی تہذیب پر اس گفتگو کے بعد اب ہم عرض کریں گے کہ طالبان کو نئے نظام تعلیم و تربیت کی تشکیل، میڈیا کے استعمال، عوام و خواص کی فکری تطہیر اور عوام کی اصلاح کے لیے کن تصورات کے تحت کیا اقدامات کرنے چاہئیں؟ (جاری ہے)

افغانستان

مدیر

کیا افغان نظامِ حکومت مطابقِ شریعت ہے؟

اس سوال پر غور کرتے ہوئے کہ عصر حاضر میں اسلام کا سیاسی نظام کیسا ہونا چاہیے، ہم 'امارت اسلامی' کی تائید کرتے ہیں کہ اس میں مغرب کی لادین جمہوریت اور اس سے تلفیق کردہ 'اسلامی جمہوریت' کا رد ہے اور یہ 'خلافت' کی طرف بڑھنے کا ایک قدم ہے

جہاں تک اس بحث کا تعلق ہے کہ عصر حاضر کی مسلم ریاست میں نظام حکومت کیسا ہونا چاہیے یا دوسرے لفظوں میں عصر حاضر میں اسلام کا سیاسی نظام کیسا ہونا چاہیے؟ تو اس سلسلے میں مندرجہ ذیل حقائق پیش نظر رکھنے چاہئیں:

ا۔ اصول اور منطق کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا طرزِ حکومت 'خلافت' بحال ہونا چاہیے۔ مسلم زوال اور مغربی فکر وتہذیب کی علمبردار قوموں کے طاقت پکڑنے اور پہلی جنگ عظیم میں عثمانی خلافت کی شکست کے بعد یورپی ملکوں نے ترکی میں اپنی گماشتہ ''نوجوان ترکوں'' کی تنظیم (Young Turks) کے سربراہ مصطفیٰ کمال پاشا کے ہاتھوں جس نظام ''خلافت'' کا خاتمہ کرایا تھا، مسلم ممالک کے یورپی استعمار سے آزاد ہونے کے بعد اسے بحال ہو جانا چاہیے تھا لیکن یورپ وامریکہ جو اس وقت بھی دنیا پر غالب ہیں، اس نظام خلافت کو بحال ہونے دینا نہیں چاہتے۔ اور مسلمان ملکوں کو انہوں نے جس طرح چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بانٹا تھا، ان میں سے اکثریت کے مسلم حکمران آج بھی مغربی قوموں کے دباؤ میں ہیں، ان سے مرعوب اور متاثر ہیں اور وہ خود بھی خلافت کا نظام بحال کرنا نہیں چاہتے۔ لہٰذا ان حالات میں مسلم امہ کی مرضی کے بغیر کسی مسلم ملک کا 'خلافت' کا نظام بحال کرنا اور اس کے رہنما کا خود کو 'خلیفۃ المسلمین' کہلانا غیر مناسب ہے کیونکہ اسے یورپ وامریکہ اور دوسرے بڑے عالمی ممالک کے علاوہ خود مسلم ممالک تسلیم نہیں کریں گے (جیسا کہ دولت اسلامیہ عراق وشام ''داعش'' کے معاملے میں ہو چکا) اس لیے موجودہ صورتِ حال میں اگر کوئی مسلم ممالک سچ مچ آزاد ہو اور اپنی مرضی سے اسلامی نظام حکومت قائم کرنا چاہے تو پھر اس کی یہی صورت بچتی ہے کہ وہ خود کو 'امارت اسلامیہ' کہلائے اور خلافت راشدہ کو ماڈل

سمجھتے ہوئے اور امت مسلمہ کے ۱۴ سو سالہ تجربات اور عصری ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا سیاسی نظام تشکیل دے۔

۲۔ بعض مسلم اہل علم نے خلافت کے نظام کے امکانات کو نہ دیکھتے ہوئے مغرب کے غیر اسلامی جمہوری نظام میں کچھ اسلامی اصول داخل کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دے دیا اور اسے عصر حاضر میں اسلام کے سیاسی نظام کی مطلوبہ شکل قرار دے دیا۔ یہ بات اصولاً بھی غلط تھی اور پھر عملاً نہ اسے مسلمانوں نے دل سے تسلیم کیا اور نہ غالب مغربی فکر و تہذیب کے علمبردار ممالک نے اس کو قبول کیا کہ وہ یہی چاہتے ہیں کہ مسلمان ان کا سیکولر، لبرل، سرمایہ دارانہ، سیاسی لادین جمہوری نظام قبول کر لیں لہٰذا 'اسلامی جمہوریت' بھی عملاً ناکام ہوئی اور اس کے ذریعے کسی مسلم ملک میں بھی نہ اسلام آسکا، نہ اسلامی قوتیں برسر اقتدار آسکیں اور نہ عامۃ الناس اسلامی طرز حیات کے قریب آسکے۔

۳۔ مغربی جمہوریت کے غیر اسلامی ہونے، اسلامی جمہوریت کے تجربے کے غیر مناسب اور ناکام ہونے اور 'خلافت' کے احیاء کے امکانات نہ ہونے کے تناظر میں ہم سمجھتے ہیں کہ طالبانِ افغانستان کا اپنے سیاسی نظام کو 'امارتِ اسلامی' قرار دینا اور اسے اسلامی اصولوں کے مطابق چلانے کی کوشش کرنا ایک قابل قبول قدم ہے بلکہ یہ ایک مبارک عمل ہے۔ ہم اس کی تائید کرتے ہیں، اسے اسلامی سمجھتے ہیں اور اس کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔

ظاہر ہے مغربی جمہوریت کے علمبردار ممالک، عالمی قوتیں، 'اسلامی جمہوریت' کی قائل دینی جماعتیں اور مسلمان حکمران سب اس نئے افغان سیٹ اپ کو اجنبی اور ناقابل قبول قرار دیں گے اور اس کی کھل کر یا دبے لفظوں میں مخالفت کریں گے لیکن ہم دلائل کی بناء پر اور شرح صدر کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ 'امارت اسلامی افغانستان' کا سیاسی نظام عین اسلامی ہے۔ ہم اس کی حمایت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے اس کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں اور اسلامی قوتوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ بھی ان خطوط پر غور فرمائیں جن کی طرف ہم نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے۔ هذا من عندنا والعلم عند الله.

اسلامی تحریکیں

مولانا عبدالغفار حسن
سابق امیر جماعت اسلامی، پاکستان

جماعتِ اسلامی ۔ کل

• ۱۹۵۰ء میں جماعت اسلامی کا امیر رہنے والی شخصیت کا ۱۹۹۳ء میں جماعت پر تبصرہ [1]

راقم الحروف ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۷ء تک سولہ سال جماعت اسلامی سے وابستہ رہا۔ اس عرصے میں بہت سے نشیب وفراز دیکھے اور متعدد سبق آموز اور عبرت انگیز واقعات رونما ہوئے۔ بعض اہم واقعات کی تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

۱۔ مولانا مودودی مرحوم، مولانا امین احسن اصلاحی اور میاں طفیل محمد پہلی نظر بندی کے بعد رہا ہوکر آئے تو اس وقت جماعت اسلامی پاکستان کی امارت کی ذمہ داری میرے ناتواں کندھوں پر تھی۔ رات کے وقت معلوم ہوا کہ صبح سویرے کوئٹہ ایکسپریس کے ذریعے یہ تینوں حضرات ملتان جیل سے رہا ہوکر تشریف لا رہے ہیں۔ راقم الحروف جماعت کے مزاج کے مطابق نظم وضبط کے ساتھ جماعت کے ارکان اور معاونین کو ساتھ لے کر اسٹیشن پہنچ گیا۔ سب حاضرین کی صف بندی کردی گئی۔ اس موقعہ پر ایک لمبے چوڑے نوجوان میرے سامنے آئے اور انہوں نے اصرار کیا کہ ''جب ٹرین پلیٹ فارم پر پہنچے گی تو اس موقع پر خوشی کے اظہار کے لیے نعرہ لگانے کی اجازت دی جائے۔'' مَیں نے ان سے کہا کہ نعرہ بازی جماعت کے مزاج کے خلاف ہے اس لیے آپ کو کسی بھی قسم کا نعرہ لگانے کی اجازت نہیں۔ وہ بار بار اصرار کرتے رہے کہ کم سے کم ایک نعرہ ضرور لگانے کی اجازت دی جائے۔ اس پر مَیں نے تنگ آ کر کہا کہ کون سا نعرہ؟ انہوں نے جواب دیا۔ 'نعرۂ تکبیر' مَیں نے کہا کہ اگرچہ یہ مطالبہ جماعت کی روایات کے خلاف ہے اور اس کے مزاج کے یکسر منافی ہے لیکن آپ کے شدید اصرار کی بناء صرف ایک بار نعرۂ تکبیر لگانے کی اجازت دیتا ہوں، اس شرط پر کہ کوئی دوسرا نعرہ ''زندہ باد'' وغیرہ نہ لگایا جائے۔

جب کوئٹہ ایکسپریس پلیٹ فارم پر پہنچی تو اس سرخ وسفید، بلند قامت نوجوان نے زور سے نعرۂ تکبیر لگایا جس کے جواب میں استقبالی کارکنوں نے زوردار انداز میں جواب دیا ''اللہ اکبر''۔ اس نعرہ سے اسٹیشن کی پوری فضا گونج اٹھی اور مسافروں میں ایک ہلچل مچ گئی۔

---

[1] مطبوعہ ہفت روزہ 'المنبر' فیصل آباد شمارہ ۲ نومبر ۱۹۹۳ء

مولانا محترم جب خیریت کے ساتھ اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گئے تو انہوں نے بعض کارکنوں سے پوچھا ''یہ نعرہ کس نے لگوایا تھا؟'' جواب میں راقم الحروف کا نام پیش کیا گیا۔ مولانا مرحوم نے ازراہِ مروت براہ راست مجھ سے دریافت کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی تاہم مولانا کے سوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک نعرۂ تکبیر لگانا بھی انہیں کو ناگوار گزرا۔

ایک وہ زمانہ تھا اور ایک اب کے حالات ہیں کہ سارا دارومدار ہی نعروں پر ہے۔ ایک نعرہ نہیں بلکہ بیسیوں قسم کے نعرے۔ ایں تفاوت از کجا تا بکجا۔ واضح رہے یہ نعرہ لگانے والے نوجوان محمد یوسف صاحب تھے یعنی امریکن نومسلم مریم جمیلہ کے شوہر۔

اب جو نعرے لگائے جارہے ہیں ان کے چند نمونے ملاحظہ ہوں: 'زمیندارو بھاگ جاؤ'، 'ہٹ جاؤ، جاگیردارو!'، 'بھاگ جاؤ، ہٹ جاؤ، سرمایہ دارو!'۔ اس قسم کے نعرے اشتراکیت کے علمبردار تو لگا سکتے ہیں لیکن اسلامی نظام کے حامی اس قسم کا نعرہ کیسے لگا سکتے ہیں؟

اسلام ظلم کا دشمن ہے خواہ وہ ظلم کسی طبقہ سے ہو۔ اگر مزدوروں کی حکومت یہی روش اختیار کرے تو وہ بھی قابل مذمت ہے۔ اگر خوف خدا نہ ہو تو خواہ سرمایہ دار ہو یا مزدور لیڈر دونوں کا رویہ یکساں ہوگا۔ خود جماعت اسلامی سے بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار وابستہ رہ چکے ہیں مثلاً اجمل خان لغاری مرحوم اور ان کے بھائی امین خان لغاری حفظہ اللہ اور سرحد میں جناب سردار علی خان صاحب۔ پاکستان اسلامی فرنٹ کے جلسہ میں نعرے لگائے گئے ''نواز شریف بدتر اور بے نظیر بدترین''۔ کیا یہ منفی نعرے اسلامی مزاج کے موافق ہیں؟ فَاعْتَبِرُوْا يَا أُوْلِي الْأَبْصَارِ۔

۲۔ دوسرا واقعہ غالباً ۱۹۵۵ء کا ہے۔ ضلع رحیم یارخان سے ایک وفد مرکز جماعت آیا جس کے ارکان تھے۔ محمد اجمل خان صاحب لغاری مرحوم (رحیم یار خان)، حکیم نور الدین صاحب مرحوم (صادق آباد)، محمد امین خان لغاری صاحب (برادر خورد محمد اجمل خان لغاری) (ماچھی گوٹھ)، محمد باقر خان صاحب مرحوم (ملتان)، مولانا عبدالخالق صاحب (چاچڑاں) ان کے علاوہ وفد میں ہوسکتا ہے مزید افراد بھی ہوں جن کے نام اس وقت یاد نہیں۔

اس وفد کے امیر نے امیر جماعت اسلامی سے گزارش کی کہ ''ہم ایک بڑے مقصد کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں''۔ محمد امین خان صاحب لغاری اپنی زمین کا بہت بڑا رقبہ (ماچھی گوٹھ میں) وقف کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہاں جماعت کی فکر کے مطابق علماء تیار کرنے کے لیے ایک عظیم الشان دارالعلوم قائم کیا جائے۔

اس پر مولانا نے جواب دیا کہ ''یہ بڑا اچھا منصوبہ ہے، اس میں مشورہ کی کیا ضرورت ہے؟'' جواب میں امیر وفد نے کہا ''اصل بات یہ ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ مرکز جماعت سے دو استاد لیے جائیں' ایک تفسیر کے لیے اور دوسرا حدیث کے لیے۔''

مولانا نے فرمایا ''اب یہ معاملہ سادہ نہیں رہا بلکہ بڑا اہم مطالبہ سامنے آیا ہے اس لیے آج کسی وقت مجلس مشاورت منعقد کرلی جائے تاکہ یکسوئی کے ساتھ اس مطالبہ کے بارے میں فیصلہ کرلیا جائے۔

مولانا کے خاص کمرے میں ایک فرشی نشست زیر صدارت مولانا مودودیؒ مرحوم ہوئی جس میں مرکز اور مقامی جماعت لاہور کے ارکان شوریٰ نے شرکت کی جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ جناب نصر اللہ خان صاحب عزیز مرحوم، امیر جماعتِ اسلامی لاہور و مدیر 'تسنیم'

۲۔ میاں طفیل محمد صاحب: قیم جماعت اسلامی پاکستان

۳۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب، رکن مرکزی مجلس شوریٰ پاکستان

۴۔ جناب نعیم صدیقی صاحب، رکن مجلس شوریٰ

۵۔ راقم الحروف (عبدالغفار حسن)، رکن مجلس شوریٰ

ان کے علاوہ جو حضرات شامل ہوئے ان کے نام یاد نہیں۔

یہ مجلس مشاورت صبح دس بجے شروع ہوئی اور دو بجے تک جاری رہی۔ چار گھنٹے کے زوردار بحث ومباحثہ کے باوجود کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ بعض ارکانِ مشاورت اس تجویز کے حق میں تھے اور بعض کو اس سے شدید اختلاف تھا۔ شدید اختلاف کرنے والوں میں سب سے زیادہ زوردار گفتگو جناب نعیم صدیقی صاحب نے کی۔ ان کا کہنا تھا کہ جماعت اسلامی دارالعلوم اور یونیورسٹیاں قائم کرنے کے لیے وجود میں نہیں آئی بلکہ یہ سب تعلیمی ادارے حصول اقتدار کے بعد اس کے قبضے میں آجائیں گے، لہٰذا اپنے ذمہ دار ارکان کو دارالعلوم سے وابستہ کرنا قطعاً غیر مناسب ہے بلکہ تحریک اسلامی کے لیے سخت مضر ہے۔

جب مولانا مرحوم نے دیکھا کہ کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا تو آخر میں انہوں نے فرمایا ''ووٹنگ ہوجائے تاکہ مجلس مشاورت کسی قطعی فیصلہ پر پہنچ سکے۔ جب رائے شماری ہوئی تو نتیجہ یہ نکلا کہ شرکاء کی ایک تہائی مجلس نے تجویز کی حمایت کی اور ایک تہائی نے مخالفت اور ایک تہائی غیر جانبدار

رہی۔ مولانا مرحوم نے بطور صدر مجلس فرمایا ''یہ نتیجہ تو امید افزا نہیں ہے لہٰذا یہ تجویز ختم کی جاتی ہے۔''

اس فیصلہ سے وفد کے ارکان کو بہت صدمہ پہنچا اور وہ بہت افسردہ نظر آنے لگے۔ یہ منظر دیکھ کر نعیم صاحب نے مولانا مرحوم سے گزارش کی کہ ''اس فیصلہ پر نظر ثانی فرمالیجیے کیونکہ بعض رفقاء بہت زیادہ رنجیدہ نظر آتے ہیں۔'' اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ ''میں یہ علت نہیں پالتا۔'' یعنی یہ تلون مزاجی درست نہیں ہے کہ کبھی کچھ رائے قائم کی جائے اور کبھی کچھ۔ آخر یہ کون سی عقل مندی ہے کہ چار گھنٹے کی بحث کے بعد پھر رحم دلی کا مظاہرہ کیا جائے۔

لیکن اب یہ حال ہے کہ جماعت کے مرکز منصورہ لاہور میں ایک عرصہ سے دارالعلوم قائم ہو چکا ہے اور اس سے تعاون کے لیے ہفت روزہ تکبیر مؤرخہ ۳ جون ۱۹۹۳ء میں زوردار اپیل شائع ہوئی ہے اور یہ اپیل صرف مرکزی دارالعلوم کے لیے نہیں ہے بلکہ پورے پاکستان میں پھیلی ہوئی شاخوں کے لیے بھی ہے۔

اگر محمد اجمل خان صاحب لغاری زندہ ہوتے تو شاید ان کی زبان پر یہ شعر ہوتا ؎

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

جناب نعیم صاحب آج کل جماعت کے توسیعی منصوبہ کے خلاف ''ہفت رنگ'' میں بہت کچھ لکھ رہے ہیں۔ وہ مولانا مودودیؒ کی تحریروں کی روشنی میں اس کو غلط قرار دے رہے ہیں، حالانکہ ۱۹۵۱ء میں جماعت اسلامی نے الیکشن میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ الیکشن میں کامیابی عوامی مقبولیت کے بغیر نہیں ہو سکتی لہٰذا ضروری تھا کہ جماعت کی پالیسی میں وسعت پیدا کی جائے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ بانیٔ جماعت اور میاں طفیل محمد کے زمانہ امارت میں عوامی مقبولیت کی رفتار مال گاڑی یا پسنجر ٹرین کی طرح تھی، موجودہ امیر جماعت نے یہ 'جرم' کیا ہے کہ اس کی رفتار کو ''تیز گام'' بنا دیا ہے۔

شخصی عقیدت میں غلو کا نتیجہ ہے کہ بانیٔ جماعت کے طرزِ عمل کو غلطی سے پاک قرار دیا جا رہا ہے حالانکہ خود ان کے زمانہ میں اور خود ان کی صدارت میں الیکشن میں شرکت کے لیے فیصلے کیے گئے اور انقلابِ قیادت کا نعرہ لگایا گیا۔ اصل میں بات یہ ہے کہ ۱۹۵۱ء تک مولانا مرحوم جمہوریت کے خلاف تھے لیکن اس کے بعد جمہوریت کی حمایت میں ان کی تحریریں منظر عام پر آئیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''اسلام کا نظریہ سیاسی'' ص ۴۳ مع حاشیہ ص ۴۶

جناب نعیم صدیقی صاحب نے ہفت روزہ ''زندگی'' لاہور میں کچھ عرصہ ہوا ایک نظم شائع کی تھی جس کا عنوان تھا ''بنامِ دلبر'' یہ نظم موجودہ قیادت کے خلاف لکھی گئی تھی، یعنی قاضی صاحب مخاطب تھے۔لیکن اب اتنا بڑا سانحہ گزر گیا کہ جو جماعت دارالعلوموں اور یونیورسٹیوں پر قبضہ کرنے اٹھی تھی وہ خود دارالعلوم قائم کرنے بیٹھ گئی۔اس عظیم سانحہ پر کوئی نظم بنام ''دلبر'' منظر عام پر نہ آسکی آخر اس کی وجہ؟

اس نظم میں ایک مصرعہ ہے۔

''کہیں تدبر کے تختِ طاؤس پر مسلط کوئی غبی ہے''

اس میں صاف اشارہ ہے کہ جماعت کو موجودہ قیادت کی پالیسی کو غباوت سے تعبیر کیا گیا ہے۔کیا یہ جماعت سے کھلی بغاوت نہیں؟اس موقع پر محترم قاضی صاحب نے نہ تو ان پر دھڑے بندی کا الزام لگایا نہ ہوس اقتدار کا اور نہ نادانستہ سازش کا بلکہ صبر واعراض کی راہ اختیار کی تاکہ جماعت میں کوئی نیا بحران نہ پیدا ہو۔جماعتی نظم کا تقاضا تو یہ تھا کہ نعیم صاحب اپنے اختلاف کو مرکزی شوریٰ میں پیش کرتے یا اجتماع ارکان میں موجودہ پالیسی کے خلاف کھل کر بولتے۔

نعیم صاحب خوش قسمت ہیں کہ اس خلاف ورزی کے باوجود جماعت کی قیادت ان کو برداشت کر رہی ہے۔یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ جماعت کا نظم اتنا ڈھیلا ہوگیا ہے کہ اب تک اس خلاف ورزی پر کوئی ایکشن نہیں لیا گیا۔خلاصہ یہ ہے کہ جماعت اپنے ابتدائی دور کے مزاج سے بہت دور جاچکی ہے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو سیدھی راہ دکھائے۔

تبصرہ: ادارہ 'المنبر'

غالباً حضرت مولانا عبدالغفار حسن صاحب نے جماعتی نظم کے حوالے سے اصولی گفتگو کرتے ہوئے جناب نعیم صدیقی کے مؤقف کو غلط ٹھہرایا ہے اور قاضی صاحب کے صبر وضبط کو سراہا ہے۔لیکن جہاں تک قاضی صاحب کی پالیسیوں کا تعلق ہے،ہم ذاتی طور پر جانتے ہیں کہ صاحب مضمون ان کے شدید ناقد ہیں۔انہوں نے تو ایسی پالیسیوں کے آغاز پر مولانا مودودیؒ کی شدید مخالفت کی تھی جو بالآخر ان کے رفقاء سمیت ان کی جماعت اسلامی سے علیحدگی پر منتج ہوئی۔اب قاضی حسین احمد نے انہی پالیسیوں کو اس انتہا تک پہنچا دیا ہے جو یقیناً مولانا عبدالغفار حسن صاحب جیسے صاحب علم وفضل شخصیت کے لیے ہی ناپسندیدہ نہیں،عام لوگوں کے لیے بھی بے حد موجبِ اضطراب ہے۔

اسلامی تحریکیں　　　پروفیسر ملک محمد حسین

جماعت اسلامی - آج

جماعت اسلامی کی ۸۰ سالہ جدوجہد کے حاصلات کا تجزیہ اور کامیابی کے لیے تجاویز

پاکستانی معاشرے میں خیر کے جزیرے بھی اِدھر اُدھر ہیں لیکن شر کا سمندر اور اللہ کے احکامات سے فرار بلکہ بغاوت کا طوفان عروج پر ہے۔ الیکٹرانک میڈیا دن رات کے ۲۴ گھنٹے اور ہفتے کے سات دن بے حیائی، فحاشی، برہنگی اور اللہ کے قانون سے بغاوت کے اسباق سمعی وبصری کشش کے ساتھ نشر کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی مذہبی پروگرام بھی نشر ہو رہا ہو تو وقفوں میں یاد دہانی کی خاطر گندے جنسی مناظر دکھانا نہیں بھولتا۔ حکومتی اور مقتدرہ کی سطح پر تو اربوں کھربوں کی لوٹ کھسوٹ اب ایک معمول ہے لیکن عوام کی سطح پر ہر دفتر اور ہر محکمہ اب کرپشن کا گڑھ ہے۔ لوگ تسلیم کر چکے کہ کوئی جائز سے جائز کام بھی رشوت کے بغیر نہیں ہوسکتا اس لیے اب وقت ضائع نہیں کیا جاتا اور بروقت رشوت دے کر اپنا مسئلہ حل کروالیا جاتا ہے۔ کرپٹ اور راشی اہل کاروں میں اس بات کی کوئی تخصیص نہیں ہے کہ متعلقہ اہل کار نمازی ہے، حاجی ہے، متشرع چہرہ ہے یا غنڈہ شکل۔ کہتے ہیں نماز بھی برحق ہے اور داڑھی بھی لیکن

ع پیٹ بھی تو ہے اور اس کے تقاضے بھی تو ہیں

معاشرے کی ساخت ہی کرپشن پر مبنی ہے۔ جب بچوں کو اچھی تعلیم کے لیے آپ کو اپنی حیثیت سے زیادہ فیس دینا پڑے گی اور جب بیماری کی صورت میں ڈاکو نما ڈاکٹروں کو بھاری معاوضہ دینا پڑے گا اور جب خود آپ کو اپنے جائز کام کے لیے بھی رشوت دینا پڑے گی تو جہاں آپ کا اختیار ہوگا، آپ بھی رشوت لے کر اپنی ضروریات پوری کریں گے۔ خوراک میں ملاوٹ اور چور بازاری عام ہے۔ قبضہ گروپوں کا دور دورہ ہے۔ انصاف بکتا ہے۔ جج کی کرسی پر نہ بھی بکے تو کالا کوٹ تو بہرحال انصاف یا بے انصافی کی قیمت لے گا، اگرچہ لوگ اب عام طور پر اپنے مقدموں کے لیے وکیل نہیں کرتے جج ہی کر لیتے ہیں۔ رشتے مفاد بن گئے ہیں اور مفاد رشتہ داریوں میں ڈھل رہے ہیں۔ حال ہی میں ڈاکٹر امجد اور چیف جسٹس چوہدری افتخار کی رشتہ داری تاریخ کی ایک تاریک مثال ہے۔ ملک میں جمہوریت ہے اور ایک جمہوری آئین بھی نافذ ہے۔

الیکشن کمیشن بھی ہے اور اس کے تحت انتخابات بھی ہوتے ہیں۔ پولنگ سٹیشن بھی بنتے ہیں۔ اور بیلٹ باکس بھی رکھے جاتے ہیں۔ جلسے جلوس بھی ہوتے ہیں اور گھر گھر جا کر ووٹ بھی مانگے جاتے ہیں۔ سارے جمہوری ڈرامے کے آخر میں کامیابی انہی کی ہوتی ہے جنہیں عالمی مقتدرہ اور مقامی مقتدرہ نے کامیاب کرانے کا فیصلہ کر رکھا ہوتا ہے۔ ایسا اکثر ممالک میں ہوتا ہے پاکستان میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ (ان حالات سے صاف ظاہر ہے کہ جماعت اسلامی اور دوسری دینی قوتیں عوام کی دینی تعلیم وتربیت اور اصلاح مؤثر انداز میں نہیں کر سکیں۔ مدیر)

یہ ہیں وہ حالات اور یہ ہے وہ منظر نامہ جس میں کسی اصلاحی قوت نے کام کرنا ہوتا ہے۔ اسلامی ملکوں میں یہ اصلاحی قوت تحریک اسلامی ہے۔ پاکستان میں پچھلے اسی سال سے تحریک اسلامی تسلسل کے ساتھ کام کر رہی ہے لیکن بجائے اس کے کہ معاملہ آگے بڑھے، بد قسمتی سے پسپائی کی کیفیت ہے۔ انتخابات میں کامیابی تو رہی ایک طرف، ان میدانوں میں بھی پسپائی ہے جو سراسر پالیسی، نظریے اور محنت کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ ایک بنیادی میدانِ عمل تعلیم ہے کہ جس کے ذریعے اذہان کی تبدیلی اور رجال کار کی تیاری اور فراہمی ہوتی ہے۔ تحریک اسلامی نے خود تو کوئی تعلیمی ادارے قائم نہیں کیے جن کی تجویز بانی تحریک نے دی تھی البتہ تحریک سے منسلک سربرآوردہ لوگوں نے تعلیمی اداروں کے قیام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے لیکن بد قسمتی سے وہ ان تینوں اصولوں کی نفی پر مبنی ہیں جن کی تحریکِ اسلامی علمبردار رہی ہے۔ وہ تین اصول ہیں: انگلش میڈیم کی نفی، کمرشلزم سے اجتناب اور مخلوط تعلیم سے انکار۔ جب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی درسی کتابیں پڑھائی جائیں گی اور ساتھ ہی دعائیں یاد کرانے کا کام اور حفظ قرآن کی کلاسیں بھی ہوں گی تو یہ فارمولا بنیادی طور پر سیکولر فارمولا ہے۔ تحریک اسلامی کے پلیٹ فارم سے اسلامی بنیاد پر لکھی گئی درسی کتب کا منصوبہ بھی شروع کیا گیا لیکن پہلے دوسرے ایڈیشن کے بعد رنگ وروغن تو بڑھا لیکن مواد کے متعلق مبینہ طور پر بعض ماہرین نے کہا کہ یہ کتابیں آکسفورڈ یونیورسٹی کا کمزور سطح کا مقامی ایڈیشن ہیں۔ رجالِ کار کی تیاری کے لیے سید مودودیؒ انٹرنیشنل اسلامک انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا تھا لیکن خواب کی تعبیر کیا ہوتی سرے سے خواب ہی جھٹک دیا گیا۔ بیانیہ کاغذوں میں تو وہی ہے لیکن عملاً کہیں نظر نہیں آتا۔ اب وہی بیانیہ برسرِ کار ہے جو دوسری جماعتوں کے ڈھول نقارے میں شامل ہے یعنی کرپشن، مہنگائی، بیروزگاری وغیرہ۔ نعروں اور بینروں میں اسلام اور جماعت اسلامی کا ذکر مفقود اور قائدین کا ذکر سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔

دوسروں نے الیکٹیبلز (Electables) پر انحصار کر کے حکومتیں حاصل کیں تو اسلامی لابی بھی اب الیکٹیبلز کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ جو سفر 'پاسبان' سے شروع ہوا تھا وہ 'شباب ملی' سے ہوتا ہوا ''جے آئی یوتھ (JI Youth)'' پر آپہنچا ہے۔ اگلا پڑاؤ کہاں ہوگا؟ اس کا پتہ تو مستقبل میں چلے گا۔ سوشل میڈیا کو دیکھیں تو تحریک اسلامی سیاسی انتخابی میدان میں بہت سرگرم ہے۔ کنٹونمنٹ بورڈز کے انتخابات میں سوشل میڈیا کے مطابق دن رات محنت ہورہی ہے۔ بلدیاتی انتخابات کے لیے سرگرمی سے مشاورتیں ہورہی ہیں اور دوسال بعد ہونے والے قومی انتخابات کی الیکشن مہم ابھی سے شروع ہوچکی ہے۔ امیدوار نامزد کردیے گئے ہیں اور ان کی پروجیکشن کا عمل زوروں پر ہے۔ دوسری طرف میدان عمل پر نظر ڈالتے ہیں تو بھیانک خاموشی طاری ہے۔ کارکنان غیر متعلق اور غیر متحرک ہیں۔ بالا بالا فیصلوں کی وجہ سے گراس روٹ لیول پر حسبِ معمول کوئی جوش وجذبہ نہیں ہے۔ یہ ہے وہ ماحول جس میں الیکشن کے ذریعے اسلامی انقلاب کا خواب دیکھا جارہا ہے۔ اوّل تو کسی سطح پر کامیابی کا کوئی امکان دُور دُور تک نظر نہیں آتا اور اگر فرض کرلیا جائے کہ اسلامی تحریک کی کامیابی یقینی ہے تو بین الاقوامی مقتدرہ اور مقامی مقتدرہ سدراہ بننے کے لیے فعال ہے اور مزید فرض کرلیا جائے کہ سب رکاوٹیں ہٹنے والی اور سب زنجیریں ٹوٹنے والی ہیں تو کیا معاشرہ جس کی تصویر ہم نے آغاز میں کھینچی تھی اس انقلاب کو سینے سے لگانے کے لیے تیار ہے؟ بیوروکریسی، سرکاری اہل کار، تاجر، دکاندار، دودھ فروش، ملاوٹ مافیا، جج، وکیل، جرنلسٹ، جرنیل اور دیگر مقامی اور بیرونی قوتیں اس تبدیلی کا ساتھ دیں گی؟ یہ سب کچھ پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

افغانستان میں طالبان کی شاندار کامیابی اور امریکہ سمیت عالمی مقتدرہ کی پسپائی ایک ایسا واقعہ ہے کہ اس کے پڑوسی ملکوں پر یقیناً اثرات ہوں گے۔ اگر طالبان اپنے ملک میں امن وامان قائم کرکے عدل وانصاف یقینی بنادیتے ہیں تو اس کی ٹھنڈی ہوائیں آس پاس کے ماحول کو متاثر کریں گی۔ پاکستان اس کا یقینی ٹارگٹ ہوگا اس لیے کہ پچھلے ۷۴ سال سے اسلامی اقدار پر مبنی نظام حکومت، عدل وانصاف، امن وامان اور خوش حالی نیز اسلامی تعلیم اور تربیت کے لیے لوگ اپنی آنکھوں میں خواب سجائے ہوئے ہیں۔ تحریک اسلامی کے کارکن بجا طور پر اس کے متمنی ہیں کہ ارض پاک میں اسلام کا عادلانہ نظام قائم ہو۔ وہ افغانستان میں مثبت تبدیلی سے ہمت حاصل کرکے اور پرجوش ہوکر بےصبری کا مظاہرہ کرسکتے ہیں۔ وہ اپنے ملک میں راستے بند پاکر مایوس

ہوسکتے ہیں۔ وہ بے صبری کے دباؤ کے تحت کچھ ناپسندیدہ قوتوں کا آلہ کار بن سکتے ہیں۔ وہ کچھ کرنے کے جوش میں اپنے نظم کے خلاف بغاوت کر سکتے ہیں۔ یہ ساری صورتیں ممکن ہیں اور یہ ساری صورتیں ناپسندیدہ ہیں۔ تحریک اسلامی کے نظم کا یہ بہت بڑا امتحان ہے۔ اس کے لیے کھلے ڈائیلاگ کی ضرورت ہے۔ گہرائی میں ہر جا کر صورتِ حال کی تحقیق کی ضرورت ہے۔ سطحی سوچ، سطحی نعرے بازی اور کچھ کیے بغیر بڑھ چڑھ کر شادمانی کے اظہار سے صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں ہوگا۔ اس سلسلہ میں صرف تحریک اسلامی کو ہی نہیں حکومتِ وقت کو بھی عقل سے کام لینا ہوگا۔ اشتعال انگیزی، طعن وتشنیع اور ایک دوسرے پر الزام تراشی سے اجتناب کر کے مثبت اور مفاہمت پر مبنی رویہ اپنانا ہوگا۔ فوری طور پر ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام کو ریلیف دیا جائے۔ امن وامان کی صورتِ حال بہتر بنائی جائے۔ عدل وانصاف کے نظام میں انقلابی تبدیلیاں لائی جائیں۔ محکموں اور دفتروں کی سطح پر اہل کاروں کی لوٹ مار کنٹرول کی جائے۔ بیوروکریسی کو لگام دی جائے اور اس کام کے لیے تحریک اسلامی اپنا تعاون حکومتِ وقت کو پیش کرے اور اگر معاملات کے سدھرنے کی کیفیت پیدا نہ ہو تو تحریک اسلامی کا ہر سطح کا نظم اس معاملے پر سخت مؤقف اختیار کرے۔

خود تحریک اسلامی کو اپنی صفیں درست کرنے کی ضرورت ہے۔ تعلیم وتحقیق اور تربیت پر فوکس کیا جائے۔ اپنے ساتھیوں کے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی بے راہ روی اور لوٹ مار کو سختی سے روکا جائے۔ قرآنی حکم کہ ''وہ کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں؟'' پر تحریکی صفوں میں عمل درآمد یقینی بنایا جائے اور کارکنوں کے باہمی تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کی جائے۔ جگہ جگہ سے جو مالی سکینڈلز کا دھواں اُٹھتا ہے، اُسے شعلوں میں تبدیل ہونے سے روکا جائے۔ امانت ودیانت کے معیار کو بہتر بنایا جائے۔ نت نئے پراجیکٹس شروع کرنے کی بجائے پہلے سے موجود منصوبوں کی پائیداری اور خود انحصاری پر توجہ دی جائے۔ انتخابات میں حصہ ضرور لیا جائے لیکن تیاری کے ساتھ اسلام اور تحریک اسلامی کو بے وقار کرنے کے لیے محض ہارنے کی خاطر الیکشن مہم میں کود پڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ الیکشن جہاں لڑے جاتے ہیں وہاں قانون اور ضابطوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ مثلاً ایک سیٹ پر جتنا خرچ کرنے کی قانون میں اجازت ہے اتنا ہی خرچ کرنا چاہیے تاکہ بعد میں الیکشن کمیشن کو اخراجات کے جعلی گوشوارے نہ دینا پڑیں۔ تحریک اسلامی کو ووٹ اس بات پر نہیں ملیں گے کہ اس نے کتنے مالی وسائل انتخابات میں جھونکے بلکہ اس بات پر ملیں گے کہ ووٹر کے قلب وذہن کو کتنا بدلا گیا۔ ان کا تصورِ دین کس حد تک قرآن وسنت کے مطابق ہوا اور تحریک کے امیدوار کا شخصی کردار کتنا جرأت مند اور صاف ستھرا ہے۔ معاشرے کا کم از کم پانچ فیصد جب تک

تحریک سے وابستہ نہیں ہوجاتا تب تک کامیابی ممکن نہیں اور حکومتی مشین کے کل پرزوں میں جب تک کم از کم بیس فیصد صادق و امین کارکن شامل نہیں ہوجاتے تب تک کامیابی کے بعد بھی ناکامی منہ کھولے کھڑی ہوگی۔

یہ سب کچھ تعلیم وتربیت اور رجال کار کی تیاری کے بغیر ممکن نہیں۔اس کے لیے اداروں کی ضرورت ہے اور اداروں کو چلانے کے لیے مالی وسائل اور مردانِ کار کی ضرورت ہے۔تحریک اسلامی تیزی کے ساتھ مالی اور مطلوب انسانی وسائل سے تہی دامن ہونے کے خطرے سے دوچار ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ دستیاب مالی اور انسانی وسائل مزید انسانی وسائل تیار کرنے پر لگادیے جائیں۔اسلامی جذبے سے سرشار اور قربانی دینے کے لیے ہر وقت تیار رجالِ کار کی ایک معقول تعداد کے بغیر اسلامی نظریۂ حیات اور اقامتِ دین کی جدوجہد آگے نہیں بڑھ سکتی۔اس سلسلہ میں سید مودودیؒ کا لٹریچر اور سید کی تعلیم وتربیت کی تجویز کردہ حکمت عملی پر عمل ضروری ہے۔ یہ تجاویز مولانا کے لٹریچر میں جابجا بکھری پڑی ہیں لیکن مولانا کی تقریر بعنوان ''مرض اور اس کا علاج'' نامی تقریر میں (جو ۱۹۴۷ء میں کی گئی) جو لائحہ عمل دیا گیا ہے اس کو زیر عمل لائے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ہم یاددہانی کی خاطر مولانا مرحوم کا مجوزہ لائحہ عمل یہاں نقل کیے دیتے ہیں کہ شاید یاد دہانی کے بعد کوئی اس پر توجہ دے:

''تربیت گاہوں میں ایسے لوگوں کو جمع کیا جائے جو سچے دل سے اسلام کی خدمت کے لیے تیار ہوجائیں۔وہاں کے کام کا نقشہ وہی ہو جو نبی کریم ﷺ کے کام کا نقشہ تھا۔اسی طرح کام کو شعبوں میں تقسیم کیا جائے،اور اسی طرح ہر شعبے میں آدمیت کو اسلامیت کے سانچے میں ڈھالنے کی تدبیر کی جائے:

۱۔ ایک شعبہ ایسا ہو جس میں اعلیٰ درجے کی علمی استعداد کے لوگ شامل ہوں۔ان میں سے جو لوگ علوم دینیہ میں دستگاہ رکھتے ہوں انہیں مغربی زبانوں اور علوم جدیدہ سے روشناس کیا جائے اور جن حضرات نے علوم جدیدہ کی تحصیل کی ہو انہیں عربی زبان اور اسلامی علوم کی تعلیم دی جائے۔پھر یہ لوگ قرآن وسنت کا گہرا مطالعہ کرکے دین میں تفقہ اور بصیرت حاصل کریں۔ اس کے بعد ان کے مختلف گروپ بنادیے جائیں۔ہر گروپ ایک ایک شعبہ علم کو لے کر اس میں اسلام کے اصول ونظریات کو جدید طرز پر مرتب کرے،زندگی کے جدید مسائل کو سمجھے اور اصول اسلام کے مطابق ان کا حل تلاش کرے۔علوم کی بنیاد میں جو مغربی نقطۂ نظر پیوست ہوگیا ہے اس کو

نکال کر اسلام کے نقطۂ نظر سے علوم کو از سرِ نو مدون کرے اور اپنی تحقیقات سے ایسا صالح لٹریچر پیدا کرے جو اسلام کی موافقت میں ایک ذہنی انقلاب برپا کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔

۲۔ دوسرا شعبہ ایسا ہو جس میں خدمت اسلام کے لیے اچھے کارکن تیار کرنے کی کوشش کی جائے۔ پاکیزہ اخلاق، مضبوط سیرت، دھن کے پکے اور اپنے نصب العین کے لیے سب کچھ قربان کر دینے والے لوگ، جو ایک زبردست انقلابی پارٹی کی صورت میں منظم ہوں، جن کی زندگی سادہ ہو، جن میں جفاکشی ہو، جن میں پورا ضبط و نظم پایا جائے اور جن کی عملی سیرت ٹھیٹھ مسلمان کی سی ہو۔ یہ پارٹی اسلام کے اصولوں پر ایک نئے اجتماعی نظام (Social Order) اور ایک نئی تہذیب (Civilization) کی تعمیر کا پروگرام لے کر اٹھے اور عامہ خلائق کے سامنے اپنے پروگرام کو پیش کر کے، زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت فراہم کرے اور بالآخر حکومت کی مشین پر قابض ہو جائے تا کہ ظلم و جور کی حکومت کو عدل کی حکومت میں تبدیل کیا جا سکے۔

۳۔ تیسرے شعبے میں ایسے لوگ ہوں جو صرف تھوڑی مدت کے لیے تربیت گاہ میں رہ کر واپس جانا چاہتے ہوں۔ انہیں صحیح علم اور اخلاقی تربیت دے کر چھوڑ دیا جائے کہ جہاں چاہیں رہیں مگر مسلمان کی طرح رہیں۔ دوسروں سے متاثر ہونے کی بجائے ان پر اپنا اثر ڈالیں۔ اپنے اصولوں میں سخت ہوں۔ اپنے عقائد میں مضبوط ہوں، بے مقصد زندگی نہ بسر کریں۔ ایک نصب العین ہر حال میں ان کے سامنے ہو۔ پاک طریقوں سے روزی کمائیں اور ان لوگوں کو ہر ممکن طریقے سے مدد دینے کے لیے تیار رہیں جو ہمیشہ مذکورہ بالا نمبر ۲ کے تحت کام کر رہے ہوں۔ یہ ان کو مالی مدد بھی دیں، ان کے کاموں میں شریک بھی رہیں، اور جہاں رہیں وہاں کی فضا کو انقلابی پارٹی کی موافقت میں تیار بھی کرتے رہیں۔

۴۔ چوتھا شعبہ ایسے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے ہو جو محض عارضی طور پر تربیت گاہ میں آ کر کچھ علمی استفادہ کرنا چاہیں، یا وہاں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے خواہش مند ہوں۔ ان لوگوں کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تا کہ وہ اسلام اور اس کی تعلیم کا گہرا نقش لے کر واپس جائیں۔

یہ ایک سرسری ساخا کہ ہے اس نظام کا جو ہمارے نزدیک اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے ایک ضروری مقدمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نظام کی کامیابی کا انحصار تمام تر اس پر ہے کہ یہ اپنی روح اور اپنے جوہر میں مدینہ طیبہ کے اس مثالی نظام کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مماثلت پیدا کرے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قائم کیا تھا۔"

مطالعۂ کتاب

ڈاکٹر اختر حسین عزمی[1]

مدیر البرہان کی کتاب
’خاموش انقلاب ناگزیر ہے‘

جناب ڈاکٹر محمد امین کی کتاب ’’خاموش انقلاب ناگزیر ہے‘‘ ان کے اِن مضامین کا مجموعہ ہے جو ان کے جریدہ ’’البرہان‘‘ میں مختلف اوقات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے مطابق دینی سیاسی جماعتوں کا معاشرے میں اثر ورسوخ کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ نہ صرف ایوانِ اقتدار، میں بلکہ گلی محلے اور تعلیمی اداروں سے بھی وہ بے دخل ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کی وجہ جمہوری انتخابی سیاست کی مجبوریاں بھی ہیں اور ان کی اکثر سرگرمیوں کا سیاست مرکز ہونا بھی۔ دینی مدارس دینی ہونے کے باوجود وہ دینی کردار تیار نہیں کر رہے جس میں تزکیۂ نفس، طہارت قلب ونظر اور تعلیم کے ساتھ تربیت بھی جھلکتی ہو۔ البتہ وہ فروعی مسائل پر دسترس رکھنے والے مسلک پرست مناظرین وواعظین پیدا کر کے معاشرے کی مزید تقسیم کا باعث بن رہے ہیں۔ جدید علمی، فکری اور تہذیبی علوم اور چیلنجز سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے معاشرہ انہیں مسجد ومدرسہ کے سوا کسی معاملے میں اپنی رہنمائی کے اہل ہی تصور نہیں کرتا۔ جدید عصری تعلیمی ادارے ایک طرف سیکولر اور لبرل شخصیت تیار کر رہے تو دوسری طرف ان میں بھی نہ تو جدت کردار موجود ہے اور نہ ہی تخلیقی ذہن تیار ہوتا رہا ہے۔ گویا ایک طرف مسلکی مقلدین تیار ہو رہے ہیں تو دوسری طرف مغرب کے اندھے مقلد اور نقال ڈھل رہے ہیں۔ اسلامی کردار کہیں موجود نہیں۔ بقول اقبال ؂

اٹھا مَیں مدرسہ و خانقاہ سے نم ناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

تبلیغی ودعوتی جماعتیں دین کی جزوی تعلیمات ومظاہر پر قناعت کر کے بیٹھ رہی ہیں۔ جدید تعلیم اور میڈیا نئی نسل کو کس رخ پر بہائے جا رہا ہے، اس سے بچاؤ کے بارے میں ان کے ہاں کوئی فکر مندی ہے نہ کوئی منصوبۂ عمل۔ جہادی تنظیموں نے معاشرے میں حق کے ابلاغ کا حق ادا

---

[1] صدر شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ کالج ٹاؤن شپ، لاہور

کیے بغیر بزور قوت تبدیلی کا جو منہج اختیار کیا ہے، وہ نہ تو پاکستان جیسی مضبوط انتظامی و عسکری مشینری رکھنے والی ریاست میں ممکن ہے اور نہ ہی اسے علماء وفقہاء کی علمی تائید حاصل ہے۔ یہ منہج معاشرے میں خانہ جنگی اور فساد انگیزی کا ذریعہ تو بن سکتا ہے، کسی اصلاح کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

ڈاکٹر امین کی فکر بنیادی طور پر دو نقطوں پر مرکوز ہے:

۱۔ دینی و دنیوی تعلیم کی یکجائی کے تصور پر مبنی تعلیمی اداروں کا قیام۔

۲۔ دینی جماعتیں خواہ محض تبلیغی ہوں یا سیاسی اور جہادی، اپنی پوری توجہ اصلاحِ معاشرہ پر لگا دیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ چند دینی مظاہر اور تہواروں کی چکا چوند اور رونق کے باوجود آج معاشرہ اپنی دینی روایت سے وابستگی کی اس سطح پر نہیں کھڑا جتنا وہ نصف صدی قبل کھڑا تھا۔ خود اسلامی تنظیموں کے کارکنان مغربی تہذیب وفکر کو غیر محسوس انداز میں نہ صرف قبول کر چکے ہیں بلکہ مختلف حوالوں سے اس کے پرچارک بھی بن چکے ہیں۔ اور یہ کتاب ان حالات کا ایک نوحہ ہے۔ دردِ دل کے ساتھ مدون کیے گئے مضامین کا یہ مجموعہ اپنے مقصد میں قابلِ تعریف ہونے کے باوجود بعض کمزور پہلو رکھتا ہے:

۱۔ مختلف اوقات میں شائع شدہ ان مضامین کو ضروری کانٹ چھانٹ کے بغیر مرتب کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس میں مضامین کی تکرار پانچ پانچ چھ چھ مرتبہ ہوئی ہے جس سے قاری اکتا جاتا ہے۔ ڈاکٹر امین خود ایک رسالے کے ایڈیٹر ہیں یقیناً وہ جانتے ہوں گے کہ کتاب کی ایڈیٹنگ کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ تین سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کے مضامین کی تکرار اگر ختم کر دی جاتی تو اس مواد کو بڑی آسانی کے ساتھ صرف ایک سو صفحات میں سمویا جا سکتا تھا اور ڈاکٹر صاحب کی بسیار نویسی کے باعث یہ کتاب جس طرح غیر مربوط دکھائی دیتی ہے، اس کا بھی کچھ ازالہ ممکن تھا۔ مولانا امین احسن اصلاحی فرمایا کرتے تھے کہ کسی مصنف کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے قارئین کے وقت کو قتل (Kill) کرے۔ مراد یہ کہ لکھنے والا اپنے مقصد و مدعا کو مربوط انداز میں پیش کرے اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ باتوں کا ابلاغ کرے۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر امین میرے جیسے بہت سے لوگوں کے وقت کے قتل کے ملزم ہیں۔ ساری کتاب کو پڑھنا

میری مجبوری تھی کہ جس محبت سے انہوں نے کتاب بھیجی اور اس پر تنقید و تبصرہ کی دعوت دی، اسے پڑھنا میرا فرض بنتا تھا لیکن مضامین کی تکرار نے جس ذہنی اذیت سے دو چار کیا، اس کا اظہار بھی ضروری ہے۔ کتاب کے دیگر قارئین سے بھی پیشگی اظہار ہمدردی....

اب بات دوستی کی نہیں حوصلے کی ہے
لازم نہیں کہ تو بھی میرا ہم خیال ہو

۲۔ کتاب کا موضوع جس مؤثر اور گہرے استدلال کا متقاضی تھا، اس کی بھی شدید کمی محسوس ہوئی۔ مضامین بالعموم اخباری کالمی انداز کے ہیں، مراد سطحی اسلوب ہے حالانکہ ڈاکٹر صاحب خود سطحی آدمی نہیں ہیں۔ اپنے مؤقف کو مدلل کرنے کے لیے آیات و تفاسیر سے، احادیث وشروح سے، سیرت نبوی کے نظائر سے، عصر حاضر کے مسائل پر گہری نظر رکھنے والے اہل علم ونظر کے تفقہ سے استفادہ واستدلال کم ہی نظر آتا ہے۔ ایسا استدلال جو قلب ونظر کو جلا بخشے اور ذہن ودماغ کو سوچنے پر مجبور کر دے۔ نسل نو میں گہرا علم وبصیرت پیدا کرنے کے متمنی اہل علم سے یہ آرزو رکھنا بے جا نہیں۔ ڈاکٹر امین جس "يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ" کے پرچم بردار ہیں، کم از کم اس سے متعلق ہی رہنمائی کے جو گوہر نایاب تفاسیر میں مذکور ہیں، ان پر روشنی ڈالتے۔ تعلیم وتزکیہ کے نبوی منہج ہی رہنمائی کے جو گوہر نایاب تفاسیر میں مذکور ہیں، ان پر روشنی میں احاطہ کیا جاتا، لیتفقهوا فی الدین کے کون سے مدارج ہیں جوامت کے پیش نظر ہونے چاہئیں، ان پر روشنی ڈالی جاتی۔ اصلاح معاشرہ کے صوفیانہ، معلمانہ وعالمانہ اور تنظیمی مناہج کا محاکمہ کیا جاتا، ان کے اچھے تجربات ومشاہدات کو سامنے لایا جاتا اور کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی جاتی۔

۳۔ چند ایک بانیانِ تنظیم کی اپنی سوچ میں تبدیلی یا فکری تہی دامنی کا ذکر کیا گیا ہے لیکن بغیر کسی واضح اور مستند حوالے کے، مثلاً مولانا مودودی نے ۱۹۴۸ء کے اوائل کے ترجمان میں لکھا کہ ہم سیاسی منہج سے واپس بھی ہو سکتے ہیں یا ۱۹۷۱ء کے الیکشن کے بعد انتخابی سیاست کے بارے میں مولانا مودودیؒ کی تبدیلیٔ فکر کی اتنی بڑی بات، اسی طرح مولانا عبدالغفار حسن کی روایت کہ ایک بڑے تعلیمی ادارے کے قیام کے لیے سردار لغاری کی طرف سے زمین اور وسائل کی پیش کش اور نعیم صدیقی کا اس پیش کش کے ٹھکرانے پر اصرار کہ جماعت اس کام کے لیے نہیں

بنی، جب اقتدار ملے گا تو ہم بہت سے ادارے بنا دیں گے، ان باتوں کو حوالوں سے مستند ہونا چاہیے۔ محض سردار لغاری لکھ دینا کافی نہیں ان کا پورا نام اور حیثیت بیان ہونا ضروری ہے۔ اہل جماعت تو اپنی تنظیمی مصلحتوں کے باعث شاید اس پر بات کرنے کو ایک طے شدہ پالیسی کے خلاف بات کرنا قرار دیں لیکن ڈاکٹر امین کے پاؤں میں تو ایسی کوئی زنجیر نہیں پڑی۔ ڈاکٹر اسرار احمد جیسے سنجیدہ داعی کا تعلیمی ادارے کھولنے سے متعلق سوال کا تضحیک آمیز جواب یقیناً ہمارے جیسے ان کے مداحین کے لیے بھی افسوس ناک ہے۔ جماعت اسلامی جیسی ہمہ جہت جماعت اور تنظیم اسلامی جیسی انتخابی سرگرمیوں کے بوجھ سے عاری جماعت اپنے فکری رہنما سید مودودی کے دین و دنیا کی یکجائی کے تصور پر مبنی ایک اچھا مدرسہ یا یونیورسٹی قائم نہ کرسکیں۔ جماعت کی سیاسی سوچ سے اختلاف کرکے نکلنے والے بڑے بڑے علماء نے بھی اچھی تعلیمی جامعہ کے پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا لیکن ان جماعتوں اور رہنماؤں کی حقیقی سوچ تک رسائی کے لیے جن عبارات و مضامین سے استدلال ہونا چاہیے تھا، وہ اس کتاب میں نہیں پایا جاتا۔

۴۔ حریت فکر اور عدم تقلید کی علمبردار دینی جماعتیں اور مسالک ہوں یا تقلید شخصی کے قائل علماء، کوئی بھی اپنے اکابر کے فکر و عمل پر آزادانہ تنقید و بحث سننے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ بقول مفتی محمد خان قادری مرحوم، اگرچہ عقیدے کے لحاظ سے وہ سب صرف انبیاء کرام کو ہی معصوم عن الخطا کہتے ہیں لیکن فکری و عملی لحاظ سے ہر ایک اپنے اپنے اکابر اور بانیان تنظیم کے لیے معصوم عن الخطا کا منصب تفویض کیے ہوئے ہے۔ اس لیے کسی بھی منہج پر تنقید کرنے کے لیے جہاں قرآن وسنت سے استدلال ضروری ہے، وہاں اس دور میں لکھنے والے کی یہ بھی اضافی ذمہ داری بن گئی ہے کہ ان جماعتوں کے وابستگان کو اپنی بات سمجھانے کے لیے انہی کے اکابرین کی تحریروں سے ہی مطمئن کرنے کی کوشش کرے۔ دینی جماعتوں کے کارکنان ہوں یا مسلک کے وابستگان، قرآن وسنت کی دلیل سے اتنا اثر نہیں لیتے جتنا کہ اپنے قائدین و اکابرین کی سوچ اور تحریر کا اثر لیتے ہیں۔ تھوڑا عرصہ قبل تقلید شخصی کے انکاری ایک نوجوان سے میں نے پوچھا کہ آپ کی جماعت تو جمہوریت کو کفر قرار دیتی تھی اور آپ لوگ الیکشن میں حصہ لینے والوں سے گھنٹوں جمہوریت کے کفر ہونے پر بحث کیا کرتے تھے، آپ کے رسائل و جرائد بھی ان بحثوں سے بھرے ہوئے ہیں تو اب الیکشن میں حصہ لینا کیسے جائز ہوگیا؟ نوجوان نے کہا کہ اپنے امیر سے میری بات ہوئی تھی انہوں نے بتایا کہ

ہم نے یہ اجتہاد کیا ہے۔ میں نے کہا: سبحان اللہ کفر و اسلام بھی اجتہادی مسئلہ بن گیا۔

تمہاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو میرے نامۂ سیاہ میں ہے

جمہوریت کو کفر قرار دینے والی جماعت کے امیر نے جمہوریت کو اسلامی قرار دے دیا اور پوری جماعت نے اتنی بڑی بات کو کتنی آسانی سے ہضم کر لیا کہ ایک موحد بھی کلمہ حق کہنے کے لیے نہ کھڑا ہوا۔ اب جہاں تقلید کے انکاریوں کا یہ حال ہے، وہاں تقلید کے قائلین کو کیسے ان کے اکابر کی عبارتیں سنائے بغیر سمجھایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اگر کوشش کرتے تو بہر حال ان اکابرین کے ہاں ڈاکٹر صاحب کے مؤقف کی تائید میں بھی بہت سی باتیں مل جاتیں۔

مدیر البرہان

ہم ڈاکٹر اختر حسین عزمی صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہماری بنیادی فکر کی تصویب کی لیکن ساتھ ہی ہمارے اسلوب پر نقد بھی کیا۔ ان کی یہ بات صحیح ہے کہ مضامین میں تکرار ہے اور حوالے دینے کا زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا لیکن اگر وہ اور قارئین ہماری مندرجہ ذیل گزارشات ملاحظہ فرمالیں تو شاید صورتِ حال انہیں اتنی گمبھیر نظر نہ آئے۔

۱۔ تدوین و تحقیق کا یہ ایک معروف اصول ہے کہ ایک جگہ مصنف تفصیلات اور ان کا حوالہ دے دیتا ہے اور پھر جب بار بار ان کا ذکر آئے تو ہر جگہ تفصیلات اور حوالہ نہیں دیتا بلکہ اس کی طرف اشارہ کر دینے پر اکتفا کرتا ہے۔ مثلاً مولانا مودودی رحمہ اللہ والا واقعہ کہ ۱۹۷۰ء والے الیکشن میں جماعت اسلامی کی ناکامی کے بعد انہوں نے اپنے منہج پر نظر ثانی کا فیصلہ کر لیا تھا، راقم نے پوری تفصیل کے ساتھ ماہنامہ البرہان کے شمارہ ستمبر ۲۰۱۸ء (صفحہ ۱۱۸ و مابعد) میں ذکر کیا ہے اور اس کے سارے شواہد جمع کر کے شائع کر دیے ہیں۔ مولانا کی تحریر کا اقتباس دیا ہے۔ شوریٰ میں ان کی تقریر کا حوالہ دیا ہے۔ مجیب الرحمن شامی صاحب کے اس زمانے کے پرچے 'طاہر' میں مولانا مودودیؒ کے بیان پر ان کے اداریے کی نقل دی ہے۔ مولانا وصی مظہر ندوی کے نام مولانا مودودی اُن کے خطوط طبع کر دیے ہیں، ایک جماعتی ذمہ دار کے حوالے سے قاضی حسین احمد کے تائیدی مؤقف کا ذکر کیا ہے۔ اب ظاہر ہے ہر جگہ تو یہ تفصیل نہیں دی جا سکتی۔

۲۔ یہ اصلاحی مضامین ہیں تحقیقی مضامین نہیں ہیں جس طرح کہ یونیورسٹی ریسرچ ہوتی ہے۔

۳۔ راقم نہ فنِ تحقیق وتدوین سے ناواقف ہے اور نہ طبعاً بسیار نویس صحافی ہے لیکن ''ماہنامے'' کا ایک مزاج اور تقاضا ہوتا ہے۔ کئی دفعہ کسی معاملے میں کوئی مؤقف اور رائے ابھی پختہ نہیں ہوتی اور جی چاہتا ہے کہ اس پر مزید غور ومطالعہ کیا جائے لیکن ماہنامے کی ضرورت ہے کہ لکھا جائے کیونکہ پرچہ تو چھپنا ہے اور ایشو تازہ ہے۔ بعد میں جب ایشو تازہ نہ رہے تو اس پر لکھنا باسی ہو جاتا ہے، بقول کسے ''عید کے بعد نئے لباس کا کیا جواز؟'' کئی دفعہ اہل البرہان کے ہاں یہ بات زیر بحث آئی کہ پرچے کو دوماہی یا سہ ماہی کر دیا جائے لیکن اس پر ہمارا اور احباب کا شرح صدر نہ ہوسکا۔ پھر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ۴۷ سال کے بوڑھے ایڈیٹر کے لیے جسے کسی معاون کی مدد بھی حاصل نہیں، کثرت اشغال میں ماہنامہ کے ہر اصلاحی مضمون کو حوالوں سے مزین کرنا آسان نہیں۔

۴۔ چھپے ہوئے مضامین کی طباعت میں تکرار بلاشبہ چبھتی ہے لیکن اگر مصنف کے پاس نئی کتاب لکھنے کا وقت نہ ہو اور وہ اپنی رائے کے ابلاغ کا خواہاں ہو تو یہ ایک مجبوری ہے۔ پھر اگر ہر مضمون نئے الفاظ پر مشتمل ہو تو ایک عام پڑھے لکھے متوسط ذہن کے قاری کے لیے وہ اتنا بورنگ بھی نہیں رہتا بلکہ تذکیر اور پختگی کا سبب بنتا ہے قرآن حکیم کا اسلوب بھی یہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ ہمارا ہر مخاطب ان کی طرح علوم اسلامیہ میں پی ایچ ڈی اور ذہین پروفیسر نہیں ہوتا۔

پاکستان افغان حکومت کو تسلیم کیوں نہیں کرتا؟

ہم نے ایک دینی سیاسی جماعت کے ذمہ دار سے پوچھا کہ پاکستان طالبان کی افغان حکومت کو کیوں تسلیم نہیں کر رہا؟ اسے ''انتظار کرو اور دیکھو'' کی پالیسی اپنانے کی بجائے پہل کرنی چاہیے تاکہ دوسروں کو ترغیب ہو۔ اگر اس سلسلے میں پاکستان پر مغربی ملکوں کا دباؤ بھی ہو تو اسے قبول نہیں کرنا چاہیے۔ انہوں نے کہا: ہمارے حکمرانوں پر خارجی سے زیادہ داخلی دباؤ ہے۔ ہم نے کہا: کیا مطلب؟ تو انہوں نے کہا کہ ہمارے حکمران نہیں چاہتے کہ طالبان امن وامان بحال کرنے، عوام کو انصاف مہیا کرنے اور ان کو غربت سے نکالنے میں کچھ بھی کامیاب ہوں کیونکہ اگر ایسا ہو گیا تو پھر ان کی حکومت کا کیا بنے گا؟

مطالعۂ کتاب نعمان ہاشمی

'گوانتاناموبے کی کہانی، ملّا ضعیف کی زبانی'

ملا عبدالسلام ضعیف کی یہ کتاب پڑھنے کے بعد جہاں دل رنجیدہ ہے وہیں شرمندگی اور ندامت بھی محسوس کررہا ہے۔ یہ مختصر سی کتاب ہر پاکستانی کو پڑھنی چاہیے۔ چند باتیں مَیں یہاں اپنے الفاظ میں نقل کررہا ہوں۔ امریکہ میں کتوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے بھی قانون موجود ہیں لیکن امریکی قید میں مسلمانوں کو کسی قسم کا کوئی حق حاصل نہیں۔ انسانیت، حقوق، مساوات اور آزادی کی بات کرنے والا امریکہ درحقیقت بے رحم، سفاک، انسان دشمن اور ظلم و بربریت کا علمبردار ہے۔ مسلمان قیدیوں کو بدترین ذہنی اور جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ اس قدر مظالم ڈھائے گئے کہ آخر پاگل ہونے والے قیدیوں کے لیے الگ کیمپ قائم کرنے پڑ گئے۔ لیکن پاگل ہوجانے والے قیدیوں کو بھی عام قیدیوں کی طرح سزائیں دی جاتی تھیں حالانکہ پاگل کو تو خدا کے قانون میں بھی استثنا حاصل ہے۔ ان مظالم کی تفصیل ملّا ضعیف کی کتاب میں پڑھی جاسکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ چھ ماہ تک ہاتھ منہ نہیں دھونے دیا گیا۔ پھر ایک دن قیدیوں کو برہنہ کرکے امریکی فوجیوں نے اجتماعی طور پہ نہانے کا حکم دے دیا۔ یہ بڑا ہی توہین آمیز اور دردناک منظر تھا سب قیدی بے لباس تھے۔

لیکن اس کے بعد جو بات ملا ضعیف نے کہی وہ میرے لئے میری قوم کے جوانوں کے لئے جاننی بہت ضروری ہے۔ ہم اجتماعی طور پر برہنگی اور ننگے پن کا شکار ہیں۔ لباس پہنے ہوئے بھی ننگے ہیں۔ ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جن کی نگاہیں برہنہ جسموں سے لذت حاصل کرنے کی شوقین نہیں۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنہیں کسی نامحرم نے برہنہ نہیں دیکھا یا جن کی نگاہوں نے کسی نامحرم کو برہنہ نہیں دیکھا۔

ملا ضعیف نے برہنہ قیدیوں سے کہا "ہم اس پر مکلف نہیں ہیں۔ آپ غسل کریں اور آنکھیں بند رکھیں یا نیچی رکھیں اور ایک دوسرے کو نہ دیکھیں۔"

کئی مہینوں کی بھوک پیاس، تشدد اور تکالیف برداشت کرنے کے بعد ایک مومن کے یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ حیا کیا ہوتی ہے، ایمان کیا ہوتا ہے، آزمائش اور امتحان میں استقامت کا مفہوم کیا ہے؟ بے لباسی کتنی بڑی ذلت ہے۔ بے حیائی اور برہنگی میں ڈوبے ہوئے معاشرے کے

لئے ملاضعیف کے اس مختصر خطبے میں بڑا سبق ہے۔

ملاضعیف نے اپنی کتاب میں لکھا کہ ان کی قید کے دوران دس سے زیادہ دفعہ قرآن کریم کی بے حرمتی کی گئی جس پر مسلمان قیدی روتے اور موت کی تمنا کرتے تھے۔ مہذب ترین قوم نے مسلمانوں کی مقدس کتاب پر پیشاب کیا اور پاؤں تلے روندا حتیٰ کہ ان کے کتے مقدس اوراق کو نوچتے رہے۔

قرآن کی قدر شاید اُن قیدیوں کو ہی معلوم ہے جنہوں نے قرآن کی خاطر عذاب جھیلے۔ ہم نے بحیثیت امت خود قرآن کی بے توقیری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہمارے ہاں قرآن صرف ایک مذہبی کتاب ہے جسے زندہ اور فوت شدگان کے ثواب کے لئے پڑھا جاتا ہے۔

ملّاضعیف کی کتاب پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ امریکہ صرف ایک آواز کو دبانے کے لئے افغانستان آیا تھا۔ یہ آواز سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تھی۔ یہ آواز معاشی آزادی کی بات کر رہی تھی۔ یہ آواز مغرب کے جمہوری نظام کی حقیقت آشکار کر رہی تھی۔ یہ آواز اسلامی نظام کی بات کر رہی تھی۔ اگر افغانستان آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے قرضے لے کر معاشی غلامی اختیار کر لیتا تو شاید کبھی افغانستان پر یلغار نہ کی جاتی لیکن افغانوں نے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کر دیا اور اسلامی نظام کی آواز بلند کی۔ یقیناً یہی جرم کافی تھا۔ ملاضعیف نے ان قیدیوں کا ذکر بھی کیا جو دوران قید اپنا دین بدل گئے۔ ان کا ذکر بھی کیا جو ایمان پر قائم رہتے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو گئے۔

ملاضعیف نے کتاب میں اُس وقت کے پاکستانی حکمرانوں کی حالت بھی بیان کی ہے جنہوں نے ڈالروں کے عوض اپنے مسلمان بھائیوں کو بیچ دیا۔ افغان سفیر ملاضعیف انہی مسلمانوں میں سے تھے۔ مہذب دنیا کی تاریخ میں سفیر فروشی کا جرم کسی دوسرے ملک نے نہیں کیا۔ تاریخ میں جیسے میر جعفر اور میر صادق کو ایمان فروش پکارا جائے گا ویسے ہی ہمارے حصے میں "برادر فروش" کے الفاظ آئیں گے۔ مغرب سے مرعوب ہمارے دانشوروں کے لئے یہ احساس بہت ضروری ہے کہ آزادی، برابری، مساوات، انصاف اور حقوق کے خوشنما نعرے لگانے والوں کا حقیقی چہرہ کس قدر مکروہ اور بھیانک ہے۔

یہ کتاب جہاں عزیمت، استقامت، ایمان اور توکل کی داستان ہے وہیں یہ سبق بھی دیتی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی سُپر پاور نہیں۔ "يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ؕ "وہی زبردست قدرت والا ہے۔ عزت اور ذلت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ گوانتاموبے کا قیدی آج پھر سے مسندِ اقتدار پر براجمان ہے۔ بے شک اللہ کا حکم طاغوت کی سب تدبیروں پر غالب ہے۔

CPL No. 296 October 2021

پاکستان میں یوں تو بہت سی یونیورسٹیاں ہیں لیکن شاید ہی ان میں سے کوئی ایسی ہو جو اسلامی مقاصد کو پورا کرنے والی ہو، دینی تناظر میں کام کرتی ہو اور ایسی مسلم شخصیت کی تعمیر کرتی ہو جو عصر حاضر میں اسلام کا بہترین نمونہ ہو۔

ڈاکٹر محمد امین نے اس کتابچے میں یہ دکھایا ہے کہ اگر کوئی مطلوبہ یونیورسٹی قائم کرنا چاہے تو اُس کی نوعیت، شکل اور منہج کیا ہوگا۔ اعلیٰ تعلیم پر غور کرنے والوں کے لیے ایک فکر انگیز تصنیف۔

ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت

ڈاکٹر محمد امین

مکتبہ البرہان لاہور

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

فون 0309-4607124 ای میل ermpak@hotmail.com